سلسلہ دعوات عبدیت کے

حصہ سوم

کا

تیسرا وعظ

ضرورۃ العمل فی الدین

حضرت حکیم الامۃ مجدد الملۃ عالم ربانی مولانا و مقتدانا حاجی
حافظ قاری شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی فاروقی چشتی حنفی قدس سرہ

بہ تصحیح

محمد سراج الحق مچھلی شہری

ناشر

مکتبہ جامی واخوانہ حسن منزل الہ آباد-۳

باہتمام حاجی عبد المجید صاحب اسرار کریمی پریس الہ آباد

ربیع الثانی سنہ ۱۳۷۶ھ

فہرست مضامین ضرورۃ العمل فی الدین

مضامین — نمبر صفحہ

دعوات عبدیت جلد سوم کا

تیسرا وعظ ملقب بہ

ضرورۃ العمل فی الدین

أَیْنَ	مَتٰی	کَمْ	کَیْفَ	لِمَا	مَنْ ضَبَطَ	کَمِ السَّامِعُوْنَ	أَشْتَاتٌ
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد	متفرقات
[illegible]	[illegible]	۳ گھنٹہ	کھڑے ہو کر	ضرورت عمل فی الدین	[illegible]	تقریباً ۲۰۰	[illegible]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیّئات اعمالنا من یہدہ اللہ فلا مضلّ لہٗ ومن یضللہ فلا ہادی لہٗ ونشہد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہٗ ونشہد انّ سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرّجیم۔ قال اللہ تبارک وتعالٰی۔ ربّنا وابعث فیہم رسولا منہم یتلوا علیہم اٰیٰتک ویعلّمہم الکتٰب والحکمۃ ویزکّیہم۔ انّک انت العزیز الحکیم

یہ وہی آیت ہے جو اس کے قبل پڑھی گئی تھی۔ دو مجلسوں میں اس کی تلاوت ہوئی ہے۔ مجلس اوّل میں اس کے متعلق تمہید عرض کی گئی تھی اور مجلس دوم میں ایک جزو کی یعنی بحث الفاظ کی زیادہ تفصیل اور دوسرے جز کی یعنی علم معانی کی قدرے تفصیل کی گئی تھی۔ تیسرا جز یعنی عمل باقی تھا اس کی تفہیم اور دوسرے جز کی تتمیم کے لئے یہ وقت تجویز کیا گیا۔ یہ حاصل ہے اس آیت کا۔ اس کے قبل یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اس آیت میں خدا تعالیٰ نے تین جزو کا بیان کیا ہے۔ یتلوا اور یعلمہم الکتاب اور یزکیہم اور یہ تینوں سب دین کے جز ہیں۔ دین کی ضرورت اس سے پہلے بیانوں میں ثابت کر دی گئی ہے۔ اس کے اعادے کی ضرورت نہیں اور اس کے تین جزو میں سے یتلوا کے متعلق تحصیل الفاظ قرآنیہ کا مضمون بھی اس کے قبل بیان کیا جا چکا ہے۔ پس اس وقت صرف جزو

علمی و عملی کا بیان ہوگا یا فی محض مضامین سابقہ کا مختصر اعادہ بطور استحضار تمہید کے مکرر کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ یہ معلوم ہوا تھا کہ ہر مقصود میں خواہ وہ ادنیٰ درجے کا ہو دو جزو ہوتے ہیں ایک جزو علمی اور ایک جزو عملی۔ مثلاً اگر ہم کوئی دنیاوی کام کرنا چاہیں تو اول ہمیں اُس کا علم ہوگا۔ پھر اُس کے بعد ہم اُس پر عمل کریں گے یا جیسے میں نے پہلے بیان میں عرض کیا تھا کہ طبیب اُس کو کہیں گے جس کو علم ادویات بھی ہو اور اُن کا استعمال بھی جانتا ہو۔ اسی طرح ہر مقصود کے اندر یہی دو جزو ہیں تو دین بھی چونکہ مقاصد علیہ سے ہے۔ اس لئے اس میں بھی یہ دو جزو معتبر ہوں گے۔ اور میں نے یہ بھی بیان کیا تھا کہ علوم میں ایک مرتبہ دال کا ہوا کرتا ہے اور ایک مرتبہ مدلول کا۔ وجس طرح تقسیم الی الجزئیں ہر مقصود میں ہوتی ہے کچھ دین کی تخصیص نہیں دال اور مدلول کا مرتبہ بھی ہر مقصود علم میں ثابت ہوگا۔ اس میں دین کی تخصیص نہ ہوگی۔ مثلاً طب کے الفاظ کہ وہ دال ہیں۔ معانی مقصود پر اُن کے بغیر اُن معانی کا سمجھنا مشکل ہے۔ پس الفاظ دال ہوئے معانی مدلول ہوئے یہاں سے الفاظ کے دال علی المعانی اور کافی فی الدلالۃ ہونے کے متعلق ایک عجیب کام کی بات یاد آئی کہ وہ اہل باطن کے لئے بہت مناسب ہے چونکہ مجمع میں اس قسم کے لوگ بھی ہوں گے۔ اس لئے اُس کا ذکر مفید ہوگا۔ وہ یہ ہے کہ بعض اہل باطن یہ سمجھتے ہیں کہ سلوک طے کرنے کے لئے کسی شیخ کی ضرورت نہیں اور اس خیال کی وجہ سے اگر کسی کو تجویز کرتے بھی ہیں تو پھر اُس کو چھوڑ دیتے ہیں۔ بالخصوص اگر قلب میں کچھ حرکت وحرارت عبادت میں کسی قسم کی لذت آنے لگے تو سمجھتے ہیں کہ اب ہم کامل ہوگئے۔ حالانکہ تکمیل اُس کو کہتے ہیں جسے اہل فن تکمیل کہہ دیں۔ بچہ ایک دو کتاب پڑھ کر سمجھتا ہے کہ میں عالم ہوگیا۔ حالانکہ علم سے ابھی اُس کو مناسبت بھی نہیں ہوتی۔ ہاں جب اہل علم یہ تجویز کر دیں کہ اب یہ عالم ہوگیا ہے اُس وقت کہا جائیگا کہ اس کو کمال فی العلم ہوگیا۔ ان لوگوں کی بعینہ وہ حالت ہے جیسے کہ مشہور ہے کہ بندر کے ہاتھ ایک ہلدی کی گرہ آگئی تھی۔ کہنے لگا کہ میں بھی پنساری ہوں تو جیسے وہ بندر ایک ہلدی کی گرہ سے پنساری بنا تھا ایسے ہی یہ لوگ بھی اپنے خیال میں ذرا سی قلب کی حرارت وغیرہ کو دیکھ کر اپنے کو کامل سمجھ بیٹھے۔ بہر حال تکمیل سے مراد وہ ہے کہ جس کو اہل فن تکمیل سمجھیں تو اگر قبل تکمیل شیخ کی وفات ہوجائے تو دوسرے سے رجوع نہیں کرتے۔ بالخصوص اگر کشف قبور بھی ہو کہ اس صورت میں تو اپنے کمال میں شبہ بھی نہیں رہتا کیونکہ کشف قبور کے لئے صاحب نسبت فنا ہونا ضروری ہے تو جب صاحب نسبت بھی ہوگئے پھر کیا کسر رہی حالانکہ کشف قبور کوئی کمال نہیں نہ مطلق نسبت کا حصول دلیل کمال ہے۔ کشف قبور کی نسبت فنا پر موقوف ہونے پر مجھے ایک محقق کی حکایت یاد آئی کہ اُن سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ قبور سے فیض ہوتا ہے یا نہیں، فرمایا کہ فیض لینے والا کون ہے۔ اُس شخص نے کہا مثلاً میں ہوں فرمایا کہ نہیں ہوتا۔ اللہ اکبر کتنا مسئلہ

ہر مقصود کے دو جزو ہوتے ہیں ایک علمی دوسرا عملی

سلوک کے لئے شیخ ضروری ہے خود بخود کی غلطی

اور کس طرح دو جملوں میں حل کر دیا۔ یہ بات اہل علم کے یاد رکھنے کی ہے کہ ان کو جواب سائل کے تابع ہرگز نہ ہونا چاہیے اور جو طرز جواب کا اُن کے لئے مصلحت ہو اس کو اختیار کرنا چاہیے گو وہ اُن کی رائے کے خلاف ہو یہ ضروری نہیں کہ جس راہ سائل لے چلے اُسی راہ چلیں جس طرح اس حکایت میں سائل نے تو یہ چاہا کہ پوری تحقیق مسئلے کی بیان کی جائے اور محقق مجیب نے اُس کو بے کار سمجھ کر اُن کی حالت کے بموجب جواب دے دیا کہ تم پورے مسئلے کو کیا کرو گے اپنا تعلق جس قدر مسئلے سے اُس کو سمجھ لو کہ تم کو تیور سے نفع نہیں ہو سکتا پس سائلین تو یہ چاہتے ہیں کہ جس راہ ہم لے چلیں اُس راہ اگر چلیں تو ہم جانیں گے کہ ہمارے سوال کا جواب ہوا ورنہ ہم سمجھیں گے کہ جواب نہیں ہوا۔ مجیبوں نے جب دیکھا کہ اُن کی یہ حالت ہے تو جس چال انھوں نے چلایا اُسی چال انھوں نے چلنا اختیار کیا۔ اس میں بڑی خرابی یہ ہوئی کہ سامعین کے امراض میں ترقی ہوتی گئی اور شبہات ترقی پذیر ہوتے گئے۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے طبیب کے پاس کوئی مریض جائے کہ جس کو مرض دق بھی ہو اور زکام بھی ہو اور جا کر حکیم سے فرمائش کرے کہ اول زکام کا علاج کر دیجئے تو اگر طبیب زکام کے علاج میں ایک مدید مدت صرف کر دے تو وہ خائن ہے۔ اُس کو چاہیے کہ مریض کو رائے دے کہ ہرگز ایسا نہ کرو۔ اول دق کی خبر لو۔ اگر مریض اس تجویز پر یہ کہے کہ حکیم صاحب کچھ نہیں جانتے تو طبیب اس وقت کیا کرے گا ظاہر ہے کہ اُس کے جہل پر رحم کرے گا اور پھر بھی اپنی ہی تجویز اور اُس کی مصلحت پر عمل کریگا اور اگر اُس نے مریض کا اتباع کیا تو وہ خود غرض ہے۔ اسی طرح محقق پر واجب ہے کہ جواب مصلحت کے موافق دے نہ کہ سائل کی مرضی کے موافق سوال میں جتنا ناشائستہ جزو ہو اُس کو نکال دے اگر سارا ہی ناشائستہ ہو تو جواب ہی نہ دے اور اگر جواب دے تو یہ ضروری نہیں کہ سب کا جواب دے بلکہ جتنا مناسب ہو اتنا جواب دے۔ مجھے یاد آیا کہ مجھ سے ایک شخص نے پوچھا کہ کافر سے سود لینا کیوں ناجائز ہے تو اُن کی مرضی کے موافق تو یہ تھا کہ میں دو ورق میں مدلل جواب دیتا مگر میں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ ایسا کرنا اُن کی مصلحت کے خلاف تھا بلکہ میں نے یہ لکھا کہ کافر عورت سے زنا کیوں ناجائز ہے۔ یہ اُس سوال کا جواب تحقیقی ہی تھا لیکن اس وقت کم علمی اس قدر چھا گئی ہے کہ وہ اس کو سمجھے ہی نہیں حاصل اس جواب کا یہ تھا کہ جو حرام قطعی ہے وہ کسی محل میں بھی جائز نہیں یہ تھا جواب اس کو سمجھ کر وہ جتنے شبہے کرتے وہ صحیح ہوتے۔ اتفاق سے وہ شخص ایک مرتبہ مجھ سے ملے وہ تو مجھے پہچانتے تھے لیکن میں نہ پہچانتا تھا۔ کہنے لگے آپ نے تو مجھے نہ پہچانا ہوگا۔ میں نے کہا بیشک میں نہیں پہچانتا۔ کہنے لگے کہ میں وہی شخص ہوں جس کے پاس سے اس قسم کا سوال جناب کے پاس آیا تھا اور اب میں پوچھتا ہوں کہ آپ نے اس قسم کا جواب کیوں نہیں دیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ یہ جواب کو کو ابھی تک نہیں سمجھے تو میں نے اُن کی سمجھ کے موافق اس استفتا کا ایک دوسرا جواب دیا۔ میں نے کہا کہ آپ

ایک عہدہ دار ہیں ۔ آپ کو ہر قسم کے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے کیا آپ سب کے ساتھ ایک سا برتاؤ کرتے ہیں یا احباب کے ساتھ دوسری قسم کا برتاؤ ہے اور اجانب کے ساتھ دوسری قسم کا ۔ کہنے لگے کہ ہر قسم کے آدمیوں سے علیٰحدہ برتاؤ ہوتا ہے ۔ میں نے کہا کہ جب یہ ہے تو فنا کا بھی ایک محکمہ ہے ۔ اس میں بھی اسی طرح کسی کو ضابطہ کا جواب دیا جاتا ہے کسی کو دوسری قسم کا میں چونکہ آپ کی حالت سے واقف نہ تھا اس لئے میں نے آپ کو ضابطہ کا جواب دیا اور اب چونکہ آپ سے ملاقات ہوگئی ہے ۔ اب انشاء اللہ تعالیٰ اس قسم کا جواب نہ آئے گا ۔ لیکن ملاقات کا جیسا اثر مجھ پر ہوگا آپ پر بھی ہوگا آپ کے پاس سے بھی اس قسم کا لغو سوال کبھی نہ آئے گا ۔ غرض اس وقت یہ ایسی آفت ہے کہ مجیب سائل کے تابع ہو جاتے ہیں مگر ان محقق کا جواب نہایت ہی نفیس تھا کہ اگر فیض لینے والا تو ہے تو نہیں ہوتا مقصود یہ ہے کہ قبور سے جو فیض ہوتا ہے تو صاحب نسبت فنا کو ہوتا ہے خیر یہ حکایت تو طبعاً بیان ہوگئی ۔ اصل بیان اس کا ہے کہ طالب اگر صاحب کشف بھی ہو جائے تب بھی اس کو شیخ سے استغنا جائز نہیں کیونکہ اس میں کفایت نہیں ہوتی وجہ یہ ہے کہ فیض کی دو قسمیں ہیں ایک بادلالت لفظیہ یعنی تعلیم و تلقین ایک غیر لفظیہ یعنی تقویت نسبت ۔ افادہ اور استفادہ میں لفظیہ بہت مفید اور محمد ہے پس صرف قبور سے استفادہ پر بس کرنا غلطی ہے کیونکہ قبور سے اتنا فیض ہوتا ہے کہ حالت موجودہ میں ترقی ہوتی ہے اور بس بخلاف زندہ کے کہ اگر کوئی شبہ ہو تو اس کو بیتیں کر کے حل کر سکتا ہے ۔ خوب مشبع طور سے تو اس کی برابر ہرگز فیض قبور نہیں ہو سکتا یہ اس کی فرع تھی کہ الفاظ کی برابر افادہ نہیں ہو سکتا ۔ یہی میں نے اجمالاً بیان کیا تھا پس علم کے متعلق دو جزو ہوئے ۔ الفاظ اور معانی اور تبیر مقصود عمل ہوا یہ حاصل ہے اس آیت کا اور یہ میں نے بیان کر دیا تھا کہ الفاظ کے متعلق کافی بحث ہوگئی ہے اور چونکہ اور علوم میں الفاظ کی ضرورت نہیں ہے ۔ اس لئے اس میں اردو وغیرہ کی نفس مقصود کے حصول میں سب برابر ہیں اور قرآن شریف میں یہ خصوصاً الفاظ بھی مقصود ہیں ۔ اس کو خوب بیان کر دیا تھا ۔ البتہ الفاظ کے متعلق ایک چھوٹی سی بات رہ گئی تھی وہ اب بیان کئے دیتا ہوں ۔ وہ یہ کہ الفاظ کے کچھ حقوق ہیں ۔ مثلاً یہ کہ وہ اپنی ہیئت کے ساتھ پڑھنے اور لکھنے دونوں میں محفوظ رہیں ۔ کیونکہ عربیت ایسی ہی ہے جیسے اردو سو اگر اردو کے قواعد پر ہے تو وہ اردو کہلائے گی ورنہ نہیں جیسے آج کل تشبہ کے لئے اردو غلط بولنے لگے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ وہ اردو نہیں ہے ۔ میں نے خود اسٹیشن کا نپور پر دیکھا کہ ہندوستانی شخص نے اردو کو خراب کر کے ایک شخص سے کہا کہ ہم یہ بات سننا نہیں مانگتا اور صحیح اردو کا چھوڑنا محض اس نیت سے کہ انگریزوں سے تشبہ ہو افسوس ہے کہ وہ اس کوشش میں ہیں کہ ہم کو اردو آجائے اور ہم اس کوشش میں ہیں کہ

جو کچھ آتی ہے وہ بھی خراب ہو جائے۔ میں نے پہلی مجلس میں عرض کیا تھا کہ وہ تو ہماری چیزیں لیتے جاتے اور ہم اُن کی چیزیں اختیار کرتے جاتے ہیں۔ یہ بھی اُسی کا ایک شعبہ ہے کیا انتہا ہے کہ الفاظ میں بھی باوجود اختیار اور قدرت کے اُن کے موافق ہونے کی کوشش کی جاتی ہے۔ غرض جیسے یہ اردو نہ تھی۔ اسی طرح اگر اردو کو بگاڑ کر پڑھا جائے تو وہ عربی نہ ہوگی۔ اس وقت جو لوگ قرآن شریف پڑھنے کی طرف توجہ کرتے ہیں وہ بھی اُس کی تصحیح کی طرف توجہ نہیں کرتے بلکہ اکثر علماء کو بھی اس کا خیال نہیں ہے۔ حالانکہ اس پر توجہ نہ کرنے سے بڑی بڑی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ قرآن شریف میں تین قسم کی غلطیاں ہوتی ہیں ایک تو وہ کہ جن کو عوام بھی سمجھتے ہیں دوسرے وہ جن کو خواص سمجھتے ہیں۔ تیسرے وہ جن کو اخص الخواص سمجھتے ہیں اس کی ایک مثال اردو میں پیش کرتا ہوں۔ مثلاً لفظ پنکھا بولتے ہیں تو نون کے بعد کاف ہے اور نون ساکن ہے لیکن نون کو اُس کے مخرج سے نہیں نکالتے بلکہ اُس کے خیشوم سے نکالا جاتا ہے اس کو سب جانتے ہیں اس کو اصطلاح میں اخفا کہتے ہیں۔ یہ اظہار اور ادغام کے بین بین ہوتا ہے تو پنکھا میں نون اخفا کے ساتھ ہو تو اگر یہاں کوئی اظہار کرے یعنی نون کو اس کے مخرج سے نکالے۔ اس طرح پن کھا تو سب ہنسیں گے اور اس کو اردو نہ کہیں گے۔ اس لئے کہ اخفا نہیں کیا تو معلوم ہوا کہ اگر قواعد سے زبان ہے تو اصلی ہے ورنہ نہیں۔ پس اسی طرح عربی زبان میں بھی ہے۔ مثلاً موقع اخفا میں اخفا واجب ہوگا جیسے پنکھا اظہار کے ساتھ غلط ہے۔ اسی طرح عربی میں بھی اگر اخفا کی جگہ اخفا نہ ہوا تو لفظ غلط ہے کتنی موٹی بات ہے مگر اس کو کوئی نہیں سمجھتا تو جیسے پنکھا اظہار سے اردو نہ رہے گا۔ اسی طرح عربی لفظ بھی اخفا کی جگہ اظہار کرنے سے عربی نہ رہے گا اور خدا تعالیٰ فرماتے ہیں قرآنا عربیا تو جب قرآن عربی ہے اور تجوید کے خلاف کرنے سے عربی نہ رہے گا تو قرآن عربی میں نہ پڑھا۔ عاقل کے لئے یہ تقریر بالکل کافی ہے۔ میں نے علمائے قرأت کے اقوال اس لئے نہیں نقل کئے کہ لوگ اُن کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ ایک مثال دے دی جس کو سب مانتے ہیں اور یہ ایک مثال نمونے کے طور پر بتلا دی ہے۔ اسی طرح بہت سے قاعدے ہیں۔ مجھے اس کا افسوس ہے کہ اس کثرت سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ ولا الضآلین ہے یا ولا لظالین لیکن اس کے سیکھنے کی طرف توجہ نہیں کی جاتی جو کام تلفظ کا ہے اُس کو کتابت سے نکالا جاتا ہے حالانکہ تلفظ کا کام کتابت سے کیسے ادا ہو کتابت میں تو صرف صفات آسکتے ہیں باقی جو امور مدرک بالسمع وہ کس طرح کتابت میں آجائیں گے۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

گر مصور صورت آں دلستاں خواہد کشید
لیک حیرانم کہ نازش را چساں خواہد کشید

اگر محبوب کی تصویر مصور بنا بھی لے گا تو اُس کے ناز و ادا کو کیوں کر دیکھا جائے گا تو اگر حسن کی صفات لکھ کر بھیج دے تو اس کے ادا کرنے کی کیفیت تو نہیں لکھ سکتا۔ کوئی فوٹوگراف تو نہیں کہ اُس کو بھیج دیا

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

ہال اگر

یہ کہا جائے کہ ہر سوال کے جواب میں ایک قاری بھیج دیا جائے تو خیر۔ غرض یہ سخت غلطی ہے کہ کتاب سے کام نکالنا چاہیں۔ بلکہ اگر سیکھنا چاہئے تو تجوید کی ضرورت ثابت ہوگئی اور بدوں اس کے جس طرح آپ جاہلوں کو غلط بولتے دیکھتے ہیں۔ اور اُن پر ہنستے ہیں۔ اسی طرح مجوّدین آپ کو بھی ہنستے ہیں مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک مدنی لکھنؤ میں آئے اور اُنھوں نے قرآن سنایا۔ ہندوستانی ذہین تو ہوتے ایک لڑکے نے اُن کی قرأت کا چربہ اُتارا۔ لوگوں نے اُس کو خوب مشق کرائی اور جب اپنے نزدیک وہ قاری صاحب سے افضل ہوگئی تو اپنا کمال ظاہر کرنے کے لئے قاری صاحب کے پاس اُس لڑکے کو لے گئے اور کہا کہ اس نے کچھ تبرّکاً آپ کا اتّباع کیا ہے۔ انھوں نے کہا ہاں سنائیے۔ چنانچہ لڑکے نے سنایا جب سنا چکا تو یہ لوگ داد کے منتظر تھے۔ قاری صاحب نے کچھ نہ کہا تو خود ہی پوچھا کہ اس نے کیسا پڑھا۔ قاری صاحب نے کہا ایسا پڑھا جیسا ہم نے ایک لغات اردو بنایا ہے کہ الخیار ککڑی الحطب لکڑی۔ العنکبوت مکڑی۔ اُس وقت حقیقت معلوم ہوئی کہ کیسا قرآن صاحبزادے نے پڑھا ہے دیکھئے اگر کوئی شخص ککڑی اور لکڑی کہنے لگے تو کیا اُس کو اردو بولنے والا کہیں گے ہرگز نہیں۔ مولانا محمد یعقوب صاحب دہلوی مہاجر مکی سے ایک عربی نے کہا کہ آپ لوگ اتنے دنوں سے عرب میں رہتے ہیں لیکن اب تک عرب جیسا قرآن شریف نہیں پڑھ سکتے۔ اُنھوں نے کہا کہ غیر زبان میں اہل زبان کی سی مہارت نہیں ہوسکتی کہنے لگے کہ کیوں نہیں ہوسکتی۔ آخر ہم اُردو بولتے ہیں۔ انھوں نے کہا آپ ہرگز اہل زبان کے برابر نہیں بول سکتے۔ اور اگر بول سکتے ہیں تو کہئے تُوڑ۔ تق تقا۔ اُن بیچارے کہا تو تتو تتا ہی نکل سکا۔ مگر یہ تو دفع الوقتی تھی وہ لوگ تو اس کے مکلف نہیں کہ اردو صحیح بولیں اور ہم تو مکلف ہیں۔

قرآن صحیح پڑھنے کے مگر خدا کا شکر ہے کہ اب چند روز سے علما نے اس پر توجہ کی ہے۔ مدارس میں قرّا بھی نوکر رکھے ہیں لیکن ضرورت اس کی ہے کہ سب ادھر متوجہ ہوں اور کچھ لہجے کی ضرورت نہیں صرف حروف کو صحیح کر لینا چاہئے اور اس میں کچھ زیادہ مدّت نہیں لگے گی صرف اٹھائیس حرف ہیں اور اُن میں بعض ایسے ہیں کہ اُن کی مشق کی ضرورت ہی نہیں۔ البتہ بعض حروف کی مشق کی ضرورت ہے جیسے ت۔ ط۔ ز۔ ض۔ ظ۔ ذ کی ترقیق تفخیم تو اگر ایک ایک کے لئے تین تین دن لئے جائیں تو ایک ماہ سے زیادہ نہ لگے گا۔ اور قرآن شریف صحیح ہو جاوے گا۔ رہے محسنات سو اُن کا سیکھنا ہر ایک کے لئے ضروری نہیں۔ نیز سارے قرآن کو سیکھنے کی

ایک قاری کی حکایت

ایک عربی سے اردو بولنے کی حکایت

قرآن [illegible]

نہیں قواعد کے موافق اگر تھوڑا بھی پڑھ لیا جائے تو کافی ہے۔ پھر سب خود صحیح ہو جائے گا۔ ہاں کسی اُستاد سے تصحیح کرنا سارے قرآن شریف کا ضروری ہے اور یہ مضمون بہت ہی ضروری ہے۔ اس کی طرف علماء کو بالخصوص توجہ کرنا چاہیئے۔ اس وقت اگر پچاس مولویوں کو جمع کر کے قرآن شریف سنا جائے تو یہ مشکل دو آدمی صحیح قرآن شریف پڑھنے والے نکلیں گے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ طلبہ فلسفہ پڑھتے ہیں منطق پڑھتے ہیں اور راس العلوم قرآن شریف کو نہیں پڑھتے اور پھر غضب یہ کہ ایسے لوگ امام ہو جاتے ہیں اور اس میں دنیاوی خرابی یہ ہے کہ بعض اغلاط پر عوام بھی مطلع ہو جاتے ہیں اور علماء کی بے قدری کرتے ہیں۔ ایک صاحب نے سورۂ ناس میں مِنَ الْجِنَّاتِ وَالنَّاس پڑھا۔ ایک صاحب نے سورہ ابی لھب میں تَبَّتْ يَدَا اَبِيْ لَحَبٍ پڑھا۔ ایک صاحب نے کہا کہ حضور اتنے بڑے عالم ہو کر غلط پڑھتے ہیں۔ کہنے لگے کس طرح پڑھوں اُن صاحب نے آہستہ سے بتلایا کہ اَبِيْ لَهَبٍ آہستہ اس لئے بتلایا کہ کوئی سُنے نہیں۔ ناحق کی رسوائی ہے تو وہ بزرگ اس آہستگی ہی کو مقصود سمجھ کر فرماتے ہیں۔ ہاں زور سے نہ پڑھا کروں ہلکے سے پڑھا کروں اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ؕ سمجھانے پر بھی نہ سمجھے بات یہ ہے کہ بلا حاصل کئے ہوئے کچھ نہیں آتا۔ دیکھئے آج کل اس کی کوشش کرتے ہیں کہ انگریزوں کا لب ولہجہ آجائے اور اُس کے لئے کیا کیا تدبیریں کی جاتی ہیں۔ کوئی اپنی اولاد کو لندن بھیجتا ہے کسی نے اپنے بچوں کو میموں کے سپرد کیا ہے۔ حالانکہ اس پر نہ پاس ہونا موقوف ہے نہ ڈگری لیکن باوجود اس کے اس کی طرف تو اتنی توجہ کہ اُس کے صرف پڑھنے ہی پر اکتفا نہیں بلکہ لب ولہجہ حاصل کرنے کی بھی تمنا اور کوشش ہے اور قرآن شریف کو ایسا چھوڑا جائے کہ اول تو پڑھا ہی نہ جائے اور اگر پڑھیں بھی تو یوں خراب کر کے۔ صاحبو! اگر ہم قرآن شریف کو چھوڑ دیں تو بتلایئے کہ پھر اور کون اُس کو پڑھے گا۔ ہر شخص کو قرآن شریف اس طرح پڑھنا چاہیئے کہ معلوم ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پڑھ رہے ہیں۔ واللہ اس میں ایسی لذت ہے کہ اگر ادراک میں تھوڑی سی صحت ہو تو ساری لذتیں ایک طرف اور تلاوت قرآن شریف ایک طرف۔ ایک بزرگ تھے مولوی کرامت علی صاحب انھوں نے قرآن شریف عرب میں سیکھا تھا۔ ایک مغنی نے ان کو پڑھتے سنا اور کہا کہ اس سے اچھی بھیرویں میں نے آج تک نہیں سنی۔ مولوی صاحب نے فرمایا میں کیا جانوں بھیرویں کیا ہوتی ہے۔ کہنے لگا آپ کو خبر نہیں کہ یہ بھیرویں ہے۔ تو قرآن شریف ایک عجیب چیز ہے کہ ہر لہجے میں ڈھل جاتا ہے۔ دیکھئے مولوی صاحب کو خبر بھی نہیں مگر اُس مغنی کو اُس کے مذاق کے موافق لطف آیا ؎

بہارِ عالم حسنش دل و جاں تازہ میدارد ۔ برنگ اصحاب صورت را بہ بوار باب معنی را

کبھی مکہ معظمہ جانا ہو تو دیکھئے گا کہ ہر گوشے سے کیسی پیاری پیاری آوازیں آتی ہیں۔ واللہ انسان محو ہو جاتا ہے اور ہم کو جو مزہ نہیں آتا تو اس لئے کہ ہم کو پڑھنا آتا نہیں ورنہ صحیح پڑھنے والوں کو خود مزہ آتا ہے فرماتے کہ قرآن شریف کی تو خاصیت یہ ہے تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ۔ اور ہم میں یہ اقشعرار ہے نہیں تو کیا بات ہے۔ کچھ تو قلوب ہی درست نہیں کچھ غلط پڑھنے کی بدولت اور جب کبھی کوئی صحیح پڑھنے والا آجاتا ہے تو غور کر کے دیکھ لیجئے کہ قلوب کی کیا حالت ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے پڑھنے میں جو ہم کو مزہ نہیں آتا۔ اس کی بڑی وجہ یہی ہے۔ ہم کو پڑھنا نہیں آتا۔ لہذا اس کی کوشش کرنی چاہئے کہ ہم کو پڑھنا آسکے یہ حصہ لفظی علم کا تو بحمد اللہ ختم ہو گیا۔ اب علم میں معانی کا درجہ اور عمل باقی رہ گیا۔ آج اس میں جو رہ گیا تھا قابل بیان ہے۔ یہ تو معلوم ہے کہ اس وقت کتنی بے التفاتی علوم دینیہ سے ہو رہی ہے۔ اب دیکھئے کہ یہ مضر ہے یا نہیں میں فضائل بیان نہیں کرتا کیونکہ ضرورت کے بتلا دینے کے بعد فضائل کے ذکر کی حاجت نہیں تو میں صرف اتنا بیان کرونگا کہ جس گورنمنٹ کے ماتحت کوئی شخص رہتا ہے اس کو اس گورنمنٹ کے قوانین جاننے کی ضرورت ہے اور قوانین دو قسم کے ہیں ایک تو وہ کہ جن میں محض ہار جیت ہو جیسے مال کے قوانین۔ سو اول تو ان کا جاننا بھی ضروری ہے کہ ان میں جلب منفعت اور دفع مضرت ہے لیکن اگر ان کو نہ سیکھا جائے تو زیادہ ضرر نہیں کیونکہ ہار جانا خسارہ ہے جرم نہیں۔ دوسرے وہ قوانین ہیں کہ ان کی خلاف ورزی جرم اور بغاوت ہے۔ اس کا سیکھنا واجب ہوتا ہے خواہ پڑھ کر یا پوچھ کر جیسے ایک شخص تجارت کرنا چاہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ دریافت کرے کہ کس چیز کی تجارت کی ضرورت ہے اور جب معلوم ہو کہ مثلاً کوکین کی تجارت کی اجازت نہیں تو اس سے رکے اب یہ سوال کرتا ہوں کہ ہم لوگ خدا تعالیٰ کی عملداری میں ہیں یا نہیں اور دوسرا سوال یہ کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ کے کچھ قوانین ہیں کہ نہیں۔ اگر ہم اس کی عملداری سے باہر ہوتے یا وہ صاحب قوانین نہ ہوتا تب تو چنداں فکر نہ تھی اور جب کہ یہ دونوں باتیں ہیں تو اب بدون قوانین سیکھے چارہ نہیں۔ خدا تعالیٰ کی عملداری سے باہر نہ ہونا تو ظاہر ہے کہ وہ سب کو قدرۃً محیط ہے۔ ہر مذہب کے لوگ بلکہ حکما بھی اس کو جانتے ہیں۔ رہا دوسرا جز تو اس کو سب مسلمان بلکہ ہر مذہب کے لوگ مانتے ہیں۔ اب یہ بات رہ گئی کہ وہ قوانین کس قسم کے ہیں آیا ان میں صرف اپنا نقصان ہے یا ان کی مخالفت جرم اور بغاوت بھی ہے سو قرآن شریف کو اٹھا کر دیکھ لیجئے کہ تمام قرآن شریف اس سے بھرا پڑا ہے کہیں اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ہے کہیں لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰا ہے غرض تمام قرآن شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ہمارے معاشرت اور معاملات دونوں کے متعلق کافی انتظام فرمایا ہے اور عدم اطاعت پر وعید بھی فرمائی ہے۔ پھر کیا شبہ رہ گیا۔ آج کل لوگ قوانین خداوندی صرف نماز روزہ کو سمجھتے ہیں باقی دوسرے امور میں اپنے کو آزاد محض سمجھتے ہیں سو اول تو میں یہ پوچھتا ہوں کہ آپ نے

قوانین خداوندی کو لوگوں نے صرف نماز روزہ میں محصور کیا

نماز روزے ہی میں کون سا اہتمام کیا ہے ۔ افسوس ہے کہ معاملات سے یہ آزادی شروع ہوتی تھی مگر چونکہ
زمانہ ترقی کا ہے ۔ ہر چیز کو ترقی ہوتی ہے ۔ اس کو بھی یہاں تک ترقی ہوئی کہ تحریرًا اور تقریرًا یہ کہا جاتا ہے
کہ جس غرض سے نماز مقرر ہوئی تھی یعنی تہذیب نفس ۔ اب بوجہ غلبۂ تہذیب کے چونکہ وہ ضروری نہیں رہی ۔ اس لئے
نماز کی ضرورت نہیں روزہ کے متعلق کہتے ہیں کہ فدیہ دیں تو روزہ رکھنے کی ضرورت نہیں اور یہ خرابی اسکی ہے کہ ہر شخص قانون شریعت کے معنی بیان
کرنے میں آزاد ہے جس کا جو جی چاہے کہدے حالانکہ موٹی سی بات ہے کہ اس وقت قانون کی کتابیں جو ہیں لیکن پھر بھی اگر کوئی فیصلہ ہائیکورٹ
میں جاکر منسوخ ہو تو اُس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ماتحت نے اس دفعہ کے معنی نہیں سمجھے ۔ اب دیکھیے کہ ماتحت بھی
جج ہے اور حاکم بالا بھی جج ہے ۔ مگر چونکہ یہ مان لیا گیا ہے کہ ہائی کورٹ کے جج کی برابر کوئی قانون کو نہیں
سمجھتا تو سب اس کا اتباع کرتے ہیں پس معلوم ہوا کہ گو قانون عام ہو اور سب کے پاس ہو مگر پھر بھی یہ ماننا
پڑے گا کہ بعض لوگ اُس قدر سمجھتے ہیں کہ دوسرے نہیں سمجھتے ہیں ۔ اب میں اس کی شرح کرتا ہوں کہ
قرآن شریف کے سمجھنے والے ایک ابوبکر و عمر و حنیفہ رح تھے اور اب آج کل کے زید و عمر ہیں تو اپنے اور اُن
علوم کا مقابلہ کر کے دیکھ لیں بلکہ اُن حضرات کے متبعین ہی کے علوم کا مقابلہ کرلیں جن کو اپنے کو بڑھا کر سمجھتے ہیں انشاء اللہ ان ہی کے علوم سے زمین و آسمان کا فرق
ظاہر ہوگا اور ابو حنیفہ رح کے علم سے تو کیا جانے کتنا فرق ہوگا تو دیکھیے کہ ہائی کورٹ کے جج اور ماتحت جج باوجودیکہ
دونوں یکساں ہیں ۔ مگر پھر بھی فرق مانا گیا تو دین میں اس کا قائل کیوں نہ ہوا جائے گا ۔ خود رائی کی اجازت
کیوں کردی جائے گی ۔ ان سلف صالحین کے مقابلے میں ۔ اگر ہم تفسیر کرنے بیٹھیں تو وہ تفسیر ایسی
ہوگی جیسے کہ ایک غیر ملکی دیہاتی کے پاس ایک من کا بوجھ تھا ۔ جب وہ اسٹیشن پہ پہنچا تو پلیٹ فارم پہ
جانے کے وقت ٹکٹ کلکٹر نے کہا کہ اس کی بلٹی لاؤ کہنے لگا کہ ہمارے پاس یہ ٹکٹ ہے ۔ یہی کافی ہے ۔
ٹکٹ کلکٹر نے کہا کہ یہ تو تمھارا ٹکٹ ہے ۔ ہم اس اسباب کا ٹکٹ مانگتے ہیں کیونکہ یہ پندرہ سیر سے زائد ہے
اب یہ دیہاتی صاحب قانون ریلوے کی تفسیر کرتے ہیں کہ پندرہ سیر کی جو حد مقرر کی گئی ہے ۔ اس لئے کہ
ہندوستانی لوگ اس سے زائد اسباب اپنے ہاتھ میں اٹھا نہیں سکتے اور ہم چونکہ اٹھا سکتے ہیں ۔ اس لئے یہ
حد ہمارے واسطے نہیں بلکہ جس قدر ہم اٹھا سکیں اُس قدر کی ہم کو اجازت ہے ۔ آپ اس تفسیر کو سن کر اندازہ
کیجئے ۔ کیا یہ تفسیر ٹکٹ کلکٹر کے مقابلے میں صحیح مانی جائے گی اور کیا ٹکٹ کلکٹر کے ذمے یہ واجب ہے یا اس
کو جائز ہے کہ اُس کو اس تفسیر کی اجازت دے ۔ نیز کیا اُس کے ذمّے یہ ضروری ہے کہ وہ اُس کے ساتھ
مناظرہ کرے یا صرف یہ کافی ہے کہ اُس کو ڈانٹ دے اور اُس سے محصول وصول کرے اور کیا اس کا یہ
کہنا کہ منشاء قانون کا یہ ہے کہ ہندوستانی پندرہ سیر سے زیادہ نہیں اٹھا سکتے قابلِ سماعت ہے اور کیا
ٹکٹ کلکٹر پہ یہ ضروری ہے کہ اُس کو نہایت ٹھنڈے دل سے سن کر نہایت اطمینان سے اُس کو سمجھا دے

کہ نہیں بھائی تم غلط سمجھے۔ قانون کا یہ منشا نہیں اور اگر وہ غصہ ہو تو کیا وہ قابل ملامت ہے۔ جیسے آج کل علماء پر الزام دھرا جاتا ہے کہ اُن کو بہت جلد غصہ آجاتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ بات یہ ہے کہ صاحب فن غیر فن داں سے کلام کرنے کو اپنے لئے عار اور تضیع اوقات سمجھتا ہے اور بزبان حال وہ کہتا ہے کہ ؎

تو ندیدی گہے سلیماں را　　　چہ شناسی زبانِ مرغاں را

بلکہ غیر فن داں پر واجب ہے کہ بجائے مناظرے کے وہ یہی کہدے کہ ؎

من ندیدم گہے سلیماں را　　　چہ شناسم زبان مرغاں را

باقی سوالات کا پیدا ہونا وہاں بھی ہے جس نے کبھی قوانین نہ سنے ہوں اُس کو بھی یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اس کی کیا وجہ پندرہ سیر کی اجازت کیوں ہوئی۔ چودہ سیر یا سولہ سیر کی اجازت کیوں نہ ہوئی تو اگر اس دیہاتی کی رائے مقبول ہے تو آج کل کے عقلاء کی رائے بھی مقبول ہے! صاحبو! کیا فن داں اور غیر فن داں برابر ہو سکتے ہیں کبھی نہیں۔ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ہ معلمین خوب جانتے ہیں کہ ان کو اپنے طالب علموں کی کم فہمی پر اکثر غصہ آتا ہے کہ کمبخت سمجھتا ہی نہیں تو کیا ان کو طالب علموں سے عداوت ہوتی ہے۔ ہرگز نہیں بلکہ یہ طبعی قاعدہ ہے۔ غرض دیکھئے کہ باوجود اس بات کے کہ اُس دیہاتی کی تفسیر ناواقف کے دل کو لگتی ہے مگر جس نے ریلوے کا یہ قاعدہ بچپن سے سنا ہے۔ اس لیئے اُس کی تفسیر پہ ہنسی آتی ہے۔ کاش اگر اہل علم کو قابل اعتماد سمجھتے تو اُن کے مقابلے میں کوئی مخترع تفسیر آپ کے دل کو نہ لگتی۔ صاحبو! کیا تیرہ سو برس کے بعد آج قرآن شریف کے معنی حل ہوئے ہیں۔ دوسرے طور پر عرض کرتا ہوں کہ آج کل کے قاعدے کے موافق کثرت رائے سے ہر بات طے ہوتی ہے اور اگر کسی بات پر اتفاق رائے ہو جائے تو بہت ہی قوت کے ساتھ وہ بات طے ہو جاتی ہے۔ سو مسائل شرعیہ تو تیرہ سو برس سے آج تک مسلمہ متفقہ چلے آتے ہیں۔ اور اگر یہ بات بھی نہ ہو تو کثرت کے بعد غیر ممبروں کی رائے کوئی قابل وقعت نہیں شمار ہوتی پس اسی طرح دین میں بھی کثرت رائے کے بعد چند ناواقفین کا اختلاف کرنا۔ کوئی چیز نہ سمجھا جائے گا۔ افسوس سے کہا جاتا ہے کہ روزے کے بارے میں اس قدر گڑبڑ کی ہے کہ جس کی حد نہیں اور آیت کی تفسیر بالکل اپنی رائے سے خلاف مقصود کی حالانکہ اُس کی حقیقت کو اہلِ علم ہی سمجھ سکتے ہیں لیکن بعض لوگوں کو کچھ شوق ہوا کرتا ہے کہ وہ اپنے مرتبے سے زیادہ سمجھنا چاہا کرتے ہیں۔ اگر ان کو اصلی جواب دیا جائے تو سمجھتے نہیں اور اگر دوسرا جواب دیا جائے تو زبردستی پر محمول کرتے ہیں مثلاً روزے ہی کو لیجئے کہ يُطِيقُونَ کا ترجمہ اثبات کا کیا اور نسخ سے انکار

کردیا۔ حالانکہ یہ آیت معنی اثبات پر منسوخ ہے اور عدم نسخ کی تقدیر پر یعنی نفی پر محمول ہے تو ایک توجیہ پر تو اصول کے جاننے کی ضرورت ہے اور دوسری توجیہ پر عربیت جاننے کی ضرورت ہے اور جس کا ذہن دونوں سے خالی ہو وہ تو اس کو بات کا بنانا ہی سمجھے گا اور اگر نفس فن سے مناسبت ہو تو تھوڑے اشارے سے اُس کو شفا ہو جاتی ہے۔ ایک منطقی صاحب کو شبہ ہو گیا کہ قرآن شریف سے مسئلہ غلامی کا ابطال ثابت ہوتا ہے کیونکہ قرآن شریف میں ہے امّا منّاً بعد وامّا فداءً اور یہ صیغہ حصر کا ہے۔ پس غیر مَن اور غیر فدا منفی ہوگا۔ ایک عالم مجھ سے کہتے تھے کہ میں نے اُن سے کہا کہ یہ قضیہ کون سا ہے کہنے لگے منفصلہ پھر انھوں نے پوچھا کہ حقیقیہ یا مانعۃ الجماع یا مانعۃ الخلو اس کو سن کر اُن منطقی مولوی صاحب کی آنکھیں کھلیں اور شبہ زائل ہوا اور بے انتہا خوش ہوئے وہ یہ سمجھے ہوئے تھے کہ یہ حقیقیہ ہے انھوں نے تنبیہ کردیا کہ ممکن ہے کہ مانعۃ الجمع ہو تو وہ تو چونکہ ذی علم تھے۔ اس لئے ایک اشارہ کر دینے سے اُن کو حل ہو گیا لیکن جس شخص کو معلوم ہی نہ ہو کہ حقیقیہ مانعۃ الخلو یا مانعۃ الجمع کس کو کہتے ہیں وہ تو اس کو گھیر گھار کا جواب ہی سمجھے گا۔ اگر ایک شخص سے کہا جائے کہ مثلث کے تین زاویے مل کر دو قائموں کے برابر ہوتے ہیں اور وہ فن اقلیدس سے واقف نہ ہو تو کسی طرح بھی آپ اُس کو نہ سمجھا سکیں گے۔ اگرچہ ہزار دفعہ ناپ کر دکھلا دیجئے جیسے ہمارے ہاں ایک شاعر تھے کہ وہ اپنے اشعار کے مصرعے دھاگے سے ناپ کر برابر کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اُن سے کسی نے کہا کہ آپ کا ایک مصرعہ چھوٹا ہے ایک بڑا ہے۔ کہنے لگے یہ تو اوپر سے ہوتی آئی ہے۔ الٰہی غنچۂ امید بکشا۔ اس کو تو کھینچ کھینچ کر پڑھا۔ گلے از روضۂ جاوید بنما۔ اس کو جلدی سے پڑھ دیا۔ دیکھو اس میں بھی مصرعۂ ثانی چھوٹا ہے۔ اب جو لوگ فن شعر سے واقف ہیں وہ اس کو سُن کر داد دیں گے اور سمجھیں گے کہ اس شخص کو کسی طرح بھی نہیں سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں مصرعے برابر ہیں۔ واللہ اے صاحبو! علماء کے نزدیک آج کل کی دلیلیں اس سے بھی بدتر ہیں۔ جیسے یہ شاعر سمجھا تھا کہ میں نے بہت بڑی دلیل قائم کردی ہے۔ ایسے ہی آج کل کے عقلاء اپنے دلائل کو مدلّل سمجھتے ہیں۔ حالانکہ وہ علماء کے نزدیک اَوْهَنُ مِنَ بَيْتِ الْعَنْكَبُوْتِ ہوتے ہیں۔ علماء فضلاء اُن پر ہنستے ہیں اور ان بیچاروں کو قابلِ رحم سمجھتے ہیں۔ اور جس طرح وزن اور تقطیع نہ جاننے کی وجہ سے اُس شاعر کو نہیں سمجھا سکتے تھے۔ اسی طرح مانعۃ الجمع اور مانعۃ الخلو نہ جاننے کی وجہ سے ان لوگوں کو بھی نہیں سمجھا سکتے مگر جاننے والوں سے پوچھئے کہ یہ ایک چھوٹا سا لفظ سُن کر اُن کی کیا حالت ہوئی کہ وجد آنے لگا۔ اسی طرح اس لطیفہ کے دو جواب ہیں ایک موقوف ہے عربیت جاننے پر دوسرا اصول جاننے پر مگر ناواقف لوگ دونوں کو زبردستی کا جواب کہتے ہیں۔ اچھا صاحب زبردستی ہی کا جواب سہی لیکن جیسے اُس دیہاتی کا علاج حکومت سے ہو گیا ایسے

ہی اگر آج یہ بات حاصل ہو تو ہم بھی بتلا دیں کہ ایسے لوگوں کے لئے اصلی جواب کیا ہے ۔ باقی اس کے سوا تو اگر دفتر کھول کر بھی سامنے رکھ دیجئے تو تسلی نہیں ہو سکتی ۔ اس وقت علما سے فرمائش کی جاتی ہے کہ ایسا جواب دیں کہ جس سے تسلی ہو جائے ! صاحبو! وہ اسباب بھی تو پیدا کرو جو موجب تسلی ہیں یعنی علوم حاصل کرو۔ علیٰ ہذا آج ایک یہ مرض بھی عام ہو رہا ہے کہ احکام میں علتیں نکالی جاتی ہیں ۔ چنانچہ روزے میں یہ علت نکالی گئی ہے کہ چونکہ ابتدا میں بہیمیت کا غلبہ تھا ۔ اس لئے روزہ اُس کی کسر کے لئے مشروع ہوا تھا اور اب چونکہ ہم مہذب ہو چکے ہیں ۔ اس لئے ہم کو ضرورت نہیں ۔ افسوس ہے کہ ہم لوگ تہذیب ہی کو نہیں سمجھتے ۔ صاحبو! تہذیب یہ ہے کہ تمام رذائل نفس کے دور ہو جائیں ۔ نہ یہ کہ مزاج میں قدرے نظافت یا تکلف آ جائے ۔ ہم لوگوں میں ہرگز تہذیب نفس نہیں ہے ہماری کیفیت یہ ہے کہ ہم میں تواضع تحمل بردباری ایثار کا نام تک نہیں بلکہ خود غرضی غضب چھچھورا پن کوٹ کوٹ کر بھرا ہے ۔ میں ایک زندہ مثال دیتا ہوں کہ اگر ہم میں سے ایک شخص نے ڈپٹی کلکٹری کی درخواست دے رکھی اور یہ شخص خوش حال فارغ البال ہو اور اسی دوران میں ایک دوسرا شخص بھی اسی عہدے کی درخواست دے جو کہ نمبر درخواست میں اس کے بعد ہو لیکن یہ دوسرا شخص مفلوک الحال غریب مقروض ہو تو ایسی صورت میں ہم نے کبھی سنا بھی نہیں ۔ اُس پہلے فارغ البال نے اُس کی فلاکت پر ترس کھا کر اپنی درخواست کو واپس لے لیا ہو ۔ اور اُس کو اپنے سے مقدم کر دیا ہو ۔ علیٰ ہذا ہر معاملہ میں ۔ تو اس کی وجہ کیا ہے یہی کہ ہم میں ایثار کی صفت نہیں بلکہ خود غرضی ہے اور اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ اخلاق درست ہیں تو یہ دیکھو کہ اس کا منشا کیا ہے ۔ سو تہذیب اخلاق کے دو منشا ہوتے ہیں کبھی تو مصلحت تمدن کے لئے اپنے اخلاق کو گونہ مہذب کیا جاتا ہے اور کبھی ضرورت دینیہ کے لئے جیسے ایک تاجر اس لئے سچ بولتا ہے کہ اس میں دکان کی بات بنی رہے گی اور لوگ اعتبار کریں گے اور دوسرا اس لئے بولتا ہے کہ خدا خوش ہو تو سمجھئے کہ دنیاوی اور تمدنی مصالح چونکہ ہمیشہ متبدل ہوتے رہتے ہیں ۔ اگر اس کو کبھی معلوم ہو کہ اب جھوٹ بولنے میں یہ مصلحت حاصل ہو گی تو وہ فوراً جھوٹ بولے گا اور دین کے مصالح چونکہ متبدل نہیں ہوتے ۔ اس لئے اُس میں یہ احتمال نہیں ہے ۔ اس کا کتنا ہی نقصان ہو تب بھی جھوٹ بولنا گوارا نہ کرے گا ۔ کیونکہ جانتا ہے کہ جھوٹ بولنا ہمیشہ مرضیٔ خدا کے خلاف ہے خلاصہ یہ ہوا کہ اگر تہذیب اخلاق خدا کے خوف سے ہو تو وہ مستحکم ہے ورنہ نہیں تو اول تو تہذیب کے وجود ہی میں کلام ہے اور اگر وجود مان بھی لیا جائے تو اُس کی پائداری میں کلام ہوگا اور یقیناً وہ بالکل ناکافی ہوگا تو اگر تہذیب نفس ہی نماز روزے کی علت ہوتی تب بھی ہم کو چھوڑنا جائز نہ تھا کیونکہ ہم کو تہذیب بھی حاصل ہو اور بالخصوص جب کہ نماز روزے سے غرض بھی دوسری ہو کہ یہ ثابت ہو کہ یہ کسی کا غلام ہے کہ اُس کے حکم پر سر تسلیم خم کئے ہوئے ہے اور اگر کہو کہ بعض نصوص کے اشارات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ روزے میں

احکام میں علتیں نکالنے کا مرض بھی عام ہے

اہل تمدن تہذیب کے معنی ہی نہیں سمجھے

نماز روزے میں علاوہ تہذیب نفس کے دوسری غرض

شہوت کا انکسار ہوتا ہے تو سمجھ لیجئے کہ یہ حکمت ہے اور میں ان کے حکمت ہونے کی نفی نہیں کرتا بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ یہ امور علت نہیں ہیں جن پر نفیاً اور اثباتاً مدار حکم ہو حکمت وہ ہے کہ حکم پر مرتب ہو اور علت وہ ہے کہ اس پر حکم مرتب ہو تو نماز روزے کا وجوب اس کے سبب سے نہیں ہوا بلکہ وجوب محض خدا کے حکم سے ہوا۔ اُس پر یہ حکمتیں مرتب ہوئیں اور اگر کوئی امر علت بھی ہو تو جب موجبؒ نے خود اُس کو متعین نہیں فرمایا تو ہماری کیا مجال ہے۔ کسی بزرگ سے پوچھا کہ معراج میں خدا تعالیٰ سے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیا باتیں ہوئی تھیں۔ انھوں نے جواب میں فرمایا کہ ؎

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں
بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ شد

حقیقت میں ہمارا کیا منصب ہے کہ ہم پوچھیں کہ اس حکم کی کیا علت ہے اور اس کی کیا حکمت ہے بانیانِ قوانین سے عام رعایا کو ہرگز یہ مجال نہیں کہ کسی ایک قانون کی وجہ بھی دریافت کرلیں تو خدا تعالیٰ سے باز پرس کرنے کی کیوں کر اجازت ہوگی۔ البتہ اگر کوئی مشیر قانون ہو تو اس کو اجازت ہے۔ تو اگر ہم کو کوئی سارٹیفکٹ خدا تعالیٰ کے ہاں سے مل گیا ہو تو پیش کریں کتنی غضب کی بات ہے کہ یہ معترض ایک سلطنت دنیوی کا ممبر تو نہ بن سکے اور خدا کی حکومت میں دخیل ہو جائے۔ صاحبو! خدا تعالیٰ کو تو پارلیمینٹ کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ پس ہمارا تو مذہب یہ ہونا چاہئے کہ ؎

زباں تازہ کردن باقرارِ تو
نینگیختن علت از کارِ تو

دیکھئے خدا تعالیٰ کے تو بہت سے حقوق ہیں۔ حاکم ہونے کا بھی محبوب ہونے کا بھی۔ فرض کیجئے اگر کسی بازاری عورت سے پوری محبت ہو جائے اور وہ بے ڈھنگے ہی حکم کرے تو اُن کو نہایت خوشی سے پورا کروگے یا نہیں تو اگر خدا تعالیٰ کی طلب ہی نہیں تب تو ایسے لوگوں سے گفتگو ہی نہیں ورنہ یہ حالت ہونی چاہئے کہ ؎

زندہ کنی عطائے تو
ور بکشی فدائے تو

جاں شدہ مبتلائے تو
ہر چہ کنی رضائے تو

آج کل لوگوں کی حالت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ سے کچھ بھی محبت ان کو نہیں ہے۔ اگر محبت ہوتی تو کیا اتنا بھی نہ کیا جاتا۔ جتنا ایک بازاری کے ساتھ کیا جاتا ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود
گوئے گشتن بہر او اولیٰ بود

بہر حال محبت کی رو سے دیکھئے یا حکومت کی رو سے دیکھئے۔ ہر طرح سر تسلیم خم کر دینا واجب ہے۔

ف حکمت اور علت کا فرق

ف ہمارا منصب علت سے سوال کرنے کا نہیں ہے۔

ف خدا تعالیٰ سے علاوہ حاکم ہونے کے محبت کا بھی علاقہ ہے۔

ف آج کل محبت الٰہی کا فقدان ہے

بعض لوگوں کو تو اس طرح ترقی ہوئی۔ اور بعض لوگ ان سے بھی زیادہ ترقی یافتہ ہوئے یعنی وہ نماز روزے میں شبہات نکالتے ہیں۔ چنانچہ ایک شخص نے کہا کہ روزہ ہے تو اچھی چیز لیکن فروری کے مہینے میں ہونا چاہیئے تھا۔ گویا آپ نے خدا تعالیٰ کو رائے دی۔ افسوس۔ اوّل تو ہم کو رائے دینا کا حق کیا ہے۔ دوسرے رائے بھی مہمل کیونکہ فروری میں سردی تمہارے ملک میں ہوتی ہے نہ کہ سارے عالم میں خدا تعالیٰ کی عجب حکمت ہے کہ سارے عالم کو مساوی حالت میں رکھا کہ ایک سال ہندوستان میں سردی میں ہے تو دوسرے ممالک میں سردی میں ہے تو ہندوستان میں گرمی میں ہے تو اس میں سب کا اوسط برابر ہو گیا جو عین عدل ہے بعض لوگوں نے ایک اور شبہ نکالا ہے کہ جہاں چھ مہینے کا دن اور چھ مہینے کی رات ہوتی ہے۔ وہاں نماز روزہ کیسے کریں گے۔ یہ ساری باتیں اس لئے ہیں کہ احکام خداوندی کی عظمت نہیں۔ دیکھئے قوانین حکومت میں کبھی آپ کو یہ شبہ نہ ہوا کہ ڈاکخانہ کا ۔/ کا ٹکٹ لفافے پر لگا دو تو خط بیرنگ نہ ہوگا اور اگر ۱عہ/ کا ٹکٹ لفافے پر لگا دو تو خط بیرنگ ہو جائے گا۔ جو لوگ اس کا راز جانتے ہیں ان کو تو چھوڑیئے۔ جو لوگ نہیں جانتے ان کو بھی کبھی شبہ نہیں ہوتا اور اگر شبہ کریں تو احمق بنائے جائیں اور سب اُن کو ہنسیں اور یہی جواب دیں کہ قانون یہی ہے۔ جب یہی جواب ہے تو اگر کوئی مولوی بھی آپ کے لغو سوالات کا یہی جواب دے کہ قانون یہی ہے کہ وہ جواب زبردستی پر محمول کیا جاتا ہے اور اُس کو قابل سماعت کیوں نہیں سمجھا جاتا اور علماء کو کیوں متعصب کہا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قانون شریعت کی عظمت دل میں نہیں اور قانون حکومت کی عظمت دل میں ہے اور جب قانون شریعت کی عظمت نہیں تو پھر کس منہ سے اپنے کو مسلمان کہتے ہو تو ایسے شبہات اُسی وقت دل میں آتے ہیں جب عظمت نہ ہو ایسا ہی یہ شبہ بھی ہے کہ جہاں چھ مہینے کا دن اور چھ مہینے کی رات ہوتی ہے۔ تو وہاں کیوں کر نماز پڑھیں اور کیسے روزہ رکھیں۔ مجھے اس پر ایک واقعہ حضرت مولانا احمد حسن صاحب مرحوم رحمۃ اللہ علیہ کا یاد آیا۔ ایک مرتبہ وہ ریل میں انٹر میں سفر کر رہے تھے اور برابر کے درجہ میں چند نوجوان آکر بیٹھے جو وضع سے انگریزی خوان تعلیم یافتہ معلوم ہوتے تھے۔ اُن کے قبل سے ایک معمر شخص سوار تھے جو صورت سے مولوی معلوم ہوتے تھے اور کسی ضرورت سے اُس وقت اُتر گئے تھے۔ اُن نوجوانوں نے اُن بیچارے کا اسباب منتشر کرکے اپنا سامان رکھ دیا وہ مولوی صاحب جو آئے اور معلوم ہوا تو اُن پر بہت ملامت کی کہ آپ لوگوں کو اس تحکم کا کیا حق تھا۔ غرض یہ سب شرمندہ ہوئے۔ اور براہ شرارت یہ چاہا کہ ان مولوی صاحب کو بھی کسی بات میں شرمندہ کریں۔ اتنے میں مولوی صاحب نماز پڑھنے لگے تو ان کو ایک بات یاد آئی۔ بعد فراغ ان میں سے بعض نے ان مولوی صاحب سے کہا کہ کیا ہم آپ سے کچھ دریافت کر سکتے ہیں۔ آج کل کی تہذیب میں یہ بھی لازم ہے کہ اگر کچھ پوچھے تو اوّل اجازت لے۔ چنانچہ اُن مولوی صاحب نے اجازت دی۔ اس پر اُن لڑکوں نے یہ سوال کیا کہ مولوی صاحب نماز فرض ہے

بعض ترقی یافتہ لوگ نماز روزہ میں شبہات نکالتے ہیں۔

منشاء شبہات کا عظمت الٰہی نہ ہونا ہے۔

روزہ کے متعلق چند ترقی یافتہ لوگوں کا شبہ اور مولانا احمد حسن کا جواب

مولوی صاحب نے کہا ہاں۔ کہنے لگے کہ وقت کی فرض ہے۔ مولوی صاحب نے کہا پانچ وقت کی۔ کہنے لگے سب پر پانچ وقت کی فرض ہے۔ مولوی صاحب نے کہا ہاں ہر مکلّف پر پانچ وقت کی فرض ہے۔ کہنے لگے سب جگہ فرض ہے۔ مولوی صاحب نے کہا ہاں۔ اس پر کہنے لگے کہ کیوں؟ جس مقام پر چھ مہینے کا دن اور چھ مہینے کی رات ہوتی ہے۔ وہاں بھی نماز پانچ وقت فرض ہے۔ اگر یہ ہے تو سال بھر میں پانچ ہی نماز فرض ہوئیں۔ مولوی صاحب نے ایک دانائی کا جواب دیا۔ کہ تم لوگ وہاں سے آرہے ہو یا وہاں جانے کا قصد ہے۔ کہنے لگے کہ صاحب نہ آرہے ہیں نہ جانے کا قصد ہے۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ جب دونوں باتیں نہیں تو یہ سوال قبل از وقت ہے۔ جب اس کی ضرورت پڑے گی اُس وقت پوچھنا لیکن اُن شریروں نے اس جواب کی قدر نہ کی بلکہ سب ہنس پڑے اور اُن مولوی صاحب کو شرمندہ کرنا چاہا۔ اتفاق سے اُن میں ایک شخص پختہ عمر کے بھی بیٹھے تھے جو وضع سے کوئی معززاہلکار معلوم ہوتے تھے۔ وہ بھی ہنسنے میں شریک تھے۔ مولانا احمد حسن صاحب کو اُن صاحب پر نہایت غصہ آیا کہ یہ تو بڑے بھی نہیں۔ ان کو کیا شامت سوار ہوئی۔ غرض کوئی اسٹیشن آیا مولوی صاحب اپنے درجے سے اُن کے درجے میں پہنچے مگر وہ لڑکے تو اُتر گئے اور وہ صاحب موجود رہے۔ انھوں نے نماز کے لئے وضو کیا تب تو مولوی صاحب کو زیادہ غصہ آیا کہ ماشاء اللہ تعالیٰ نمازی ہو کر ان کی یہ حالت ہے۔ مولوی صاحب نے اُن سے عہدہ اور فرائض عہدہ دریافت کرکے پوچھا کہ آپ کے ذمہ دن رات کتنے گھنٹے کام کرنا ہے۔ انھوں نے مثلاً چھ گھنٹے بتلایا۔ مولانا نے کہا اگر ایسے مقام پر جہاں چھ مہینے کا دن اور چھ مہینے کی رات ہوتی ہے۔ گورنمنٹ کی حکومت ہو جائے اور آپ کی وہاں بدلی ہو جائے تو کیا وہاں بھی رات دن میں چھ گھنٹے کام کرنا ہوگا تو سال بھر میں چھ گھنٹے کام کرنا پڑا۔ اس کا حساب کس طرح ہوگا۔ کہنے لگے اندازہ کرلیں گے۔ مولوی صاحب نے فرمایا افسوس دنیاوی حکومت کے قانون پر جو اشکال وارد ہو اس کی توجیہ تو اس طرح آسانی سے ہوسکتی ہے اور یہی توجیہ اُس اشکال میں نہ ہوسکی بلکہ تمسخر کرتے ہو، تم نہیں آتی بہت شرمندہ ہوئے اور توبہ کی۔ غرض اس قسم کے شبہات ہونے لگے ہیں۔ ایک صاحب کہنے لگے کہ شب قدر میں فضیلت ہے تو کہاں کی شب قدر میں۔ ہندوستان کی یا لندن کی۔ کیونکہ غروب ہر جگہ کا مختلف ہے۔ مولانا احمد حسن صاحب نے خوب جواب فرمایا کہ بعض مواسم میں کچہری دس بجے ہوتی ہے تو کہاں کے دس بجے مراد ہوتے ہیں۔ ہندوستان کے یا لندن کے جو جواب اس کا ہے وہی اُس کا ہے کہ ہر جگہ کی شب قدر میں فضیلت ہے۔ خدا تعالیٰ کے ہاں کیا کمی ہے۔ جب یہاں غروب ہو یہاں کے لئے جب وہاں غروب ہو تو وہاں کے لئے۔ یہ دو چار مثالیں نمونے کے طور پر بیان کردی ہیں۔ اس قسم

شب قدر ایک صاحب کا شبہ اور اس کا جواب

شبہات پیدا ہونے کی دو وجہیں اور ایک مثال

کے لغو شبہات بہت سے ہیں اور ان سب کی وجہ یہ ہے کہ احکام شریعت کی عظمت دلوں میں نہیں رہی اور دوسرے یہ کہ اُن کی ضرورت نہیں سمجھی گئی کیونکہ انسان جس چیز کو ضروری سمجھا کرتا ہے اس میں شبہات نہیں نکالا کرتا مثلاً اگر کوئی مریض طبیب کے پاس جاوے اور وہ نسخہ لکھ کر دے اور مرض سخت ہو تو اعتماد کے بعد یہ سوال نہیں کرتا کہ آپ نے فلاں دوا کیوں نہیں لکھی یا فلاں دوا کا یہ وزن کیوں لکھا۔ اس کا دونا یا نصف کیوں نہیں لکھا۔ کیونکہ جانتا ہے کہ اگر ذرا بھی بے ڈھنگا پن کیا تو حکیم صاحب خفا ہو کر مطب سے نکال دیں گے اور نسخہ بھی نہ دیں گے نتیجہ یہ ہوگا کہ میں مروں گا۔ اگر شریعت کو بھی ضروری سمجھتے تو احکام کے بتانے والوں کا وجود غنیمت سمجھتے جیسے طبیب کا وجود غنیمت سمجھا جاتا ہے۔ ہاں اگر نسخہ بنانا ہی نہ ہو تو اُس میں جتنے چاہیں عیب نکال دیتے ہیں۔ صاحبو! واللہ اگر دین کی طلب ہوتی تو غنیمت سمجھتے کہ احکام کے معلوم ہونے کے ذرائع موجود ہیں۔ مگر چونکہ کام کرنا نہیں ہے۔ اس لئے طرح طرح کے شبہات پیدا ہوتے ہیں اور انواع انواع کے بے ڈھنگے سوالات کئے جاتے ہیں۔ ایک شخص نے مجھ سے سوال کیا کہ نماز پانچ وقت کی کیوں فرض ہوئی میں نے کہا تمھاری ناک منہ پر کیوں لگی ہے گدّی پر کیوں نہ لگی کہنے لگے کہ اگر گدّی پر لگتی بری لگتی۔ میں نے کہا کہ بُری تو جب لگتی کہ صرف تمھاری ناک گدّی پر ہوتی اور اگر سب کی گدّی پر ہوتی تو ہرگز بُری نہ لگتی تو کیا وجہ کہ سب کی ناک گدّی پر کیوں نہیں لگی۔ میں کہتا ہوں کہ اوّل اپنی خبر لیجیے اُس کے بعد نماز وغیرہ تک نوبت آئے گی۔ بہت بہتر ہے کہ انسان اپنی دنیا کی تحقیقات میں لگے۔ دین کی تحقیق ہو چکی ہے۔ اُس پر عمل کافی ہے۔ دوسرے جب تیرہ سو برس کی تحقیق آپ کے نزدیک غلط ثابت ہوئی تو تیرہ منٹ کی تحقیق کیوں کر صحیح یقینی ہے۔ صاحبو! سلامتی کی بات یہی ہے کہ شاہرہ پر چل کر سیکڑوں پار ہو گئے اُس کو چھوڑ کر ایک غیر مجرب پگڈنڈی کو اختیار نہ کرو نیز کیا آپ سے قبل کوئی اور ہمدرد اسلام ہوا ہی نہیں۔ کیا ابوبکرؓ و عمرؓ کو دین کا کچھ درد ہی نہ تھا اور کیا ان کو آپ کے برابر بھی عقل نہیں تھی اور اگر عقل نہ تھی تو کیا وجہ کہ ہرقل اور کسریٰ تک پر حضرت عمرؓ اور اُن کے مصاحبین کی گفتگو کا اثر ہوتا تھا۔ اُن کی عقلوں کا اندازہ اس سے کیجئے کہ اُن کے پاس نہ نقشے تھے نہ جغرافیہ اور جب مصر و دمشق قسطنطنیہ فتح کیا ہے تو ان مقامات پر کس طرح قبلہ رُخ نہایت ٹھیک سمت میں مسجدیں بنائیں کہ آج تک آلات ہندسہ سے سب برابر ثابت ہوئیں اور یہ ایک چھوٹی سی بات ہے۔ اس سے بڑی بڑی ہزاروں باتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نہایت درجہ عاقل تھے اور بہت بڑے مدبّر تھے۔ دیکھئے ملکی انتظام کس طرح کا کیا۔ پھر اُن کو وہ شبہات کیوں نہ پیدا ہوئے۔ وہ اتنے مہذب تھے۔ انھوں نے نمازیں کیوں نہ چھوڑیں۔ کیوں روزہ میں ترمیم نہ کی۔ معلوم ہوا کہ اول کے طریق کو چھوڑ کر دوسرا طریق اختیار کرنا خطرناک ہے۔ نابینا کے لئے یہی

نماز کے پانچ وقت فرض ہونے پر ایک شخص کا اعتراض اور جواب

مناسب ہے کہ کسی بنیا کے ساتھ ہولے اور جدھر کو وہ لے چلے اُدھر کو چلے اور کسی موقع پر اگر بنیا نے کہا کہ یہاں نالی ہے اور نابنا صاحب لگے دلیل پوچھنے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ہاتھ چھوڑ دے گا اور یہ گر کر مریں گے۔ پھر میں پوچھتا ہوں کہ یہ ترمیمیں جو پیش کی جاتی ہیں اُن سے غرض کیا ہے آیا دنیا کا فائدہ یا دین کا سو ظاہر ہے کہ دین کا تو کوئی فائدہ نہیں۔ ہاں دنیا کا فائدہ ہے کہ نماز پڑھنے سے بچیں گے پھر وہ نہ رہے گا تو آزادی نصیب ہوگی۔ سود حلال ہو جائے گا تو مال میں ترقی ہوگی۔ یہ مسئلہ طویل الذیل ہے۔ میں اس وقت صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر فرضاً مصلحت نکل سکتی ہے تو صرف یہی نکل سکتی ہے اور فرضاً اس لئے کہ ہنوز اس میں بھی کلام ہے کہ اُن کو مصلحت کہنا بھی درست ہے یا نہیں لیکن اگر مان بھی لیا جائے تو میں کہتا ہوں کہ یہ مصالح تو بغیر دین میں کلام کئے بھی حاصل ہو سکتی ہیں۔ مثلاً مال میں ترقی اس طرح بھی ہو سکتی ہے کہ سود کو حرام سمجھا جائے اور پھر اس کا مرتکب ہوا جائے کیونکہ ترقی تو فقط سود لینے سے ہے نہ کہ سود کے حلال کہنے سے تو اگر برباد ہی ہونا ہے تو سود ہی لو سود کو حلال تو نہ کہو کہ ایمان بھی جاتا رہے اور سود لینے سے تو فقط تم گنہگار ہو گئے آئندہ نسلیں تو ایمان سے خارج نہ ہوں گی برخلاف اس کے کہ اگر سود کو حلال کہا تو تم بھی ایمان سے خارج ہوئے اور آئندہ نسلیں بھی۔ علیٰ ہذا پردے سے گھبرانا۔ سو اول تو یہ عجیب بات ہے کہ پردے میں رہیں تو عورتیں اور جی گھبرائے مردوں کا خیر اگر تمہارے نزدیک پردے کا توڑ دینا ہی مصلحت ہے تو پردے کو واجب سمجھ کر ہی چھوڑ دو۔ بے پردگی کا مقصود تو اس طرح بھی حاصل ہو جائے گا اور تمہارے نزدیک اس واسطے کہا کہ واقع میں پردے کا توڑنا ہرگز مصلحت نہیں ہو سکتا اور یہ جو بعض کہتے ہیں کہ صاحب جب طبائع میں فساد ہوتا ہے تو پردے میں بھی سب کچھ ہو جاتا سو یہ کوتاہی نظر کی دلیل ہے واقع میں جو کچھ خرابیاں ہوئیں وہ بے پردگی یا ادھورے پردے کی وجہ سے ہوئیں۔ بھلا کون عاقل کہہ سکتا ہے کہ مرد کبھی اجنبی عورت کو نہ دیکھے اور عورت کبھی اجنبی مرد کو نہ دیکھے اور پھر اُن میں کسی قسم کا فساد ہو سکے اور جب ذرا سی بے پردگی میں اتنے فساد ہوئے تو پوری بے پردگی میں جتنے فساد ہوں کم ہے۔ اسی طرح اگر نماز کو چھوڑنا ہی ہے تو فرض سمجھ کر بھی تو چھوڑا جا سکتا ہے۔ اس کی کیا ضرورت ہے کہ فرضیت سے انکار کر کے ایمان بھی برباد کر لو۔ ایک صاحب کہنے لگے کہ اگر سود کو حلال نہ سمجھیں تو قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ کیونکہ حرام سمجھنے کی صورت میں کم لوگ سود لیں گے۔ میں نے کہا اول تو آپ کو دوسروں کی کیا فکر دوسرے حلال کہہ کر بھی تمام قوم ترقی نہیں کر سکتی کیونکہ جو مسلمان قوت ایمان سے سود کو چھوڑ بیٹھے ہیں وہ تمہارے یا مولویوں کے کہہ دینے سے بھی کبھی نہ لیں گے بلکہ یوں کہیں گے علما بگڑ گئے تو حلال کہہ کر بھی سود خواروں کی تعداد دس پانچ سے زیادہ نہ ہوگی۔ ایک صاحب نے قربانی پر اعتراض کیا کہ اس سے

کیا فائدہ کہ ذبح کر کے کھیتوں میں دبا دیا اور وجہ اس فساد کی یہ ہے کہ اپنے خیال میں احکام کا ایک مبنیٰ تراش لیا ہے۔ مثلاً قربانی کا مبنیٰ یہ تراش لیا ہے کہ مساکین کو نفع ہو اور چونکہ ذبح کر کے کھیتوں میں دبانے سے یہ مقصود حاصل نہیں ہوتا۔ اس لئے اعتراض کیا جاتا ہے۔ اس اعتراض کا جواب صرف اس قدر کافی ہے کہ۔ ع۔ سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجاست۔ میں بیان کرتا ہوں کہ اگر قربانی کر کے ایک حبّہ گوشت کا بھی کسی کو نہ دو تو قربانی کا ثواب ملتا ہے تو معلوم ہوا کہ یہ مقصود قربانی کا نہیں کہ لوگوں کو نفع ہو ورنہ صرف ذبح کرنے سے کیوں ثواب ملتا۔ اب رہی یہ بات کہ پھر کیا حکمت ہے تو حکمت یہ ہے کہ بندے کو بہ حیثیت محب ہونے کے یہ مناسب تھا کہ اپنی جان فدا کرتا اس کا بدل خدا تعالیٰ نے یہ مقرر فرمایا کہ ایک پیارے جانور کو ذبح کرو۔ بیٹا اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب اور عزیز ہوتا ہے تو گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جان جاں مانگی گئی تھی۔ اسی کو قرآن شریف میں فرماتے ہیں سُنَّۃَ اَبِیْکُمْ اِبْرَاھِیْمَ تو مقصود یہ تھا کہ اپنی جان دی جائے مگر اس کا بدلہ یہ مقرر فرما دیا کہ جانور کو ذبح کر دو اور محبت ایسی چیز ہے کہ موقع پر لوگوں نے اپنی جانیں بھی قربان کر دی ہیں۔ ایک وکیل صاحب مجھ سے کہتے تھے کہ ایک بزرگ صاحب حال جن کو لوگ مسخرا سمجھتے ہیں۔ حج کرنے کے لئے گئے۔ جب خانہ کعبہ کے سامنے پہنچے تو منطوق کی زبان سے نکلا کہ یہ کعبہ ہے۔ اس وقت ان پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہوئی اور یہ شعر ان کی زبان سے نکلا ؎

چو رسی بکوئے دلبر بسپار جان مضطر　　کہ مبادا بار دیگر نرسی بدین تمنّا

یہ کہتے ہی ایک چیخ ماری اور جان بحق ہو گئے۔ سینکڑوں اولیاء اللہ کی حکایت ہے کہ ایسے اوقات میں ان کی جان نکل گئی۔ حضرت نجم الدین کبریٰ کی حکایت ہے کہ ان کے سامنے کسی نے یہ پڑھ دیا۔ جاں بدہ جاں بدہ جاں بدہ۔ آپ نے فرمایا کہ محبوب جان طلب کر رہا ہے مگر افسوس کوئی جان دینے والا نہیں اور پھر فرمایا کہ۔ جان دادم جان دادم جاں دادم۔ اور یہ کہتے ہی جان نکل گئی۔ لیکن پھر بھی ایسے لوگ بہت کم ہیں۔ فرماتے ہیں۔ وَلَوْ اَنَّا کَتَبْنَا عَلَیْہِمْ اَنِ اقْتُلُوْا اَنْفُسَکُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِیَارِکُمْ مَّا فَعَلُوْہُ اِلَّا قَلِیْلٌ مِّنْہُمْ۔ اور اگر سب کے سب ایسے ہی ہوتے بھی تو ایک سال میں سب کے سب ختم ہو جاتے یہ تو رحمت ہے کہ اگر خیر جانور ہی دیدو تو وہ بھی کافی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی حکم ہے کہ جانور عزیز ہو۔ حدیث میں ہے۔ سمّنوا ضحایاکم فانھا علی الصراط مطایاکم۔ حضرت عمرؓ نے جب سورۂ بقر ختم کی تو ایک اونٹنی ذبح کی تھی جس کی قیمت تین سو اشرفی ملتی تھی۔ الحاصل یہ معلوم ہو گیا کہ حکمت قربانی کی وہ نہیں ہے جو کہ اس وقت لوگوں نے

قربانی کی حکمت اور غرض اور دلیل

محبت کی ... اور ... کے متعلق حکایات

عزیز ... قربانی

تراش رکھی ہے بلکہ یہ حکمت ہے اور یہ بھی ہم نے تبرعاً تبلا دیا۔ ورنہ اصل مسلک ہمارا یہ ہے کہ ؎

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو ۔ کہ کس نہ کشود و نکشاید بحکمت ایں معمہ را

خدا تعالیٰ کے اسرار کا احاطہ ہم کیا کر سکتے ہیں اور جب ضرورت ثابت ہو گئی تو ہم کو حکمت یا اسرار کے دیکھنے اور تبلانے کی ضرورت بھی نہیں۔ بہر حال دین میں اختراع نہ کرو بلکہ علم کی تکمیل کرو یا علماء کی تقلید کرو اور بدوں ان دونوں باتوں کے ہمارا مذہب اور دین بالکل ڈانواڈول ہے۔ بالخصوص اس آزادی کے زمانے میں۔ اسی ضرورت علم دین کی طرف اس آیۃ میں اشارہ ہے یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ۔ اس آیۃ میں مختلف تفسیریں ہیں۔ میرے خیال میں حکمت سے مراد علوم اجتہادیہ اور کتاب سے مراد علوم منصوصہ۔ اور میں اس وقت اس کی تفصیل نہیں کرتا۔ مگر اس وقت کے رفع اغلاط کے لئے اتنا تبلائے دیتا ہوں کہ اجتہاد ہر شخص کا معتبر نہیں بلکہ اس کا اجتہاد معتبر ہے جس میں سامان بھی ہو اور یہ طے ہو گیا ہے کہ ہم میں قوت اجتہادیہ نہیں ہے۔ اس کے لئے میں ایک مسئلہ مثال کے لئے عرض کرتا ہوں۔ اس سے پورے طور پر سمجھ میں آجائے گا کہ ہم میں قوت اجتہادیہ بالکل نہیں ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اگر دو شخص جنگل میں ہوں اور ایک کو غسل کی ضرورت ہو اور دوسرے کو وضو کی ضرورت ہو اور پانی وہاں ہو نہیں۔ اس لئے دونوں نے تیمم کیا اور یہ دونوں شخص جمیع صفات علمیہ و عملیہ میں مساوی ہوں سوائے اس تفاوت مذکور کے تو اگرچہ امامت دونوں کی جائز ہے۔ لیکن گفتگو اس میں ہے کہ افضل کس کی امامت ہے سو ہمارے اجتہاد سے تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جس کو وضو کی ضرورت ہے اس کی امامت افضل ہے۔ کیونکہ اس میں حدث اصغر تھا اور اس لئے نجاست حکمی اس میں کم تھی اور طہارت میں دونوں برابر تھے تو وضو والے کی طہارت اکمل ہوئی۔ مگر فقہاء کے اقوال دیکھنے سے معلوم ہوا کہ حکم برعکس ہے اور وجہ یہ ہے کہ تیمم خلیفہ ہے غسل اور وضو کا اور غسل افضل ہے وضو سے تو افضل کا خلیفہ بھی افضل ہو گا تو غسل کا تیمم افضل ہو گا وضو کے تیمم سے۔ اب دیکھئے فقہائے متاخرین کا یہ اجتہاد ہے مگر ہم اس تک بھی نہ پہنچ سکے کیونکہ اجتہاد محض پڑھنے سے نہیں ہوتا بلکہ احادیث کے جمع کرنے اور لغت پر عبور ہونے اور اس کے بعد تقوی و طہارت کے حاصل ہونے سے ایک خاص ملکہ ہوتا ہے اور جب ہم میں یہ سب باتیں نہیں تو ہم کو سوائے تقلید کے چارہ نہیں۔

اب میں یہ تبلاتا ہوں کہ مسلمانوں میں علم کیونکر عام ہو۔ کیونکہ یہ تو بہت مشکل ہے کہ سب کے سب مولوی ہو جائیں۔ آج کل لوگ اس سے بھی گھبراتے ہیں کہ علماء اس کی کوشش کرتے ہیں کہ سب کے سب مولوی ہو جائیں۔ سو میں کہتا ہوں کہ ہم سب کو مولوی نہیں بناتے بلکہ اگر سب بنیں بھی تو ہم روک دیں کیونکہ تجربہ یہ ہے کہ ان لوگوں میں ہمت اور قناعت اور دانائی اور ورع نہ ہو ان کو مقتدا بنا دینے سے بہت سی

خرابیاں دین میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور ہمت سے مراد دین کی ہمت ہے نہ کہ دنیا کمانے کی ہمت۔ اور ایسے طماع لوگ ہیں جنھوں نے دنیا داروں کے سامنے دست طمع دراز کر کے اکثر لوگوں کو علم دین سے متنفر کر دیا ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ علم دین کا ثمرہ یہ ہوتا ہے تو اگر ہماری اولاد پڑھے گی تو اُن میں بھی یہی باتیں پیدا ہوں گی لہٰذا ایسے لوگوں کو ہم ہرگز مولوی ہونے کی رائے نہ دیں گے۔ بلکہ مولوی ہونا اور خدمت دین اُس کا کام جس کی یہ حالت ہو ؎

اے دل آں بہ کہ خراب از مے گلگوں باشی — بے زر و گنج بصد حشمتِ قاروں باشی

یہ تو مال میں اُس کی حالت ہو اور جاہ میں یہ حالت ہو کہ ؎

در رہِ منزلِ لیلیٰ کہ خطرہاست بجاں — شرط اوّل قدم آنست کہ مجنوں باشی

اور یہ حالت ہو کہ صرف ایک کا طالب ہو ؎

دلا را مے کہ داری دل درو بند — دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

اور یہ حالت ہو کہ۔ عاشقاں را مذہب و ملت جداست۔ اب آپ ہی اندازہ کیجئے کہ سب کے سب ایسے کہاں ہیں تو اگر سب کو مولوی بنایا جاوے تو کس قدر خرابیاں پیدا ہوں۔ میں نے ایک استفتاء دیکھا کہ اُس میں ایک مولوی صاحب نے ساس کو حلال کر دیا تھا اور کیونکر حلال کیا وہ یہ کہ یعنی یہ لکھا کہ اس شخص کی بیوی بوجہ جہالت کلمات کفر و شرک میں ہمیشہ سے مبتلا ہے۔ اس لئے اُس کا نکاح اُس مسلمان سے صحیح نہیں ہوا اور جب نکاح نہیں ہوا تو ساس۔ ساس نہ ہوئی اور حرمت مصاہرۃ حنفیہ کا مذہب ہے ہم پر حجت نہیں۔ پس بیوی کو چھوڑ کر ساس سے نکاح درست ہے۔ خوب کہا ہے۔

بدگہر را علم و فن آموختن — دادنِ تیغست دست راہزن

تو اگر اس مذاق کے لوگ مقتدا بنیں گے تو کیا کچھ خرابیاں ہوں گی۔ اس لئے مولویت کے لئے انتخاب صحیح ہونا چاہیئے سو آپ بھی اپنے بچوں میں سے انتخاب کیجئے اور اگر کہو کہ دیہاتی یا غریب لوگ تو پڑھ رہے ہیں تو سمجھو کہ وہ آپ کے لئے کافی نہیں ہیں کیونکہ وہ آپ کے اندرونی حالات سے واقف نہیں۔ اس لئے وہ آپ کی اصلاح نہیں کر سکتے۔ لہٰذا شہر والوں کے لئے شہر والے اور گاؤں والوں کے لئے گاؤں والے مولوی ہونے چاہئیں اور غرباء کے لئے غرباء اور امراء کے لئے امراء کیونکہ غرباء کی وقعت امراء کی نظر میں نہیں دوسرے اپنے کام میں لگے ہیں۔ اس لئے امراء کو توجہ کرنا نہایت ضروری ہے یہ اپنی اولاد میں سے منتخب کریں لیکن خدا کے لئے ایسا انتخاب نہ کیجئے جیسا کہ اب تک کیا ہے کہ اولاد میں جو سب سے زیادہ بیوقوف ہوا اُس کو عربی پر متوجہ کر دیا۔ بلکہ زیادہ فطین زیادہ ذکی ہو اُس کو عربی کے لئے انتخاب کیجئے۔

اور اُس کے اخلاق درست کیجئے اُس میں تواضع پیدا کیجئے اور سب سے بہتر یہ ہے کہ اپنے سے جدا کر کے کسی صاحب دل کے پاس بھیج دیجئے۔ چند روز بھی اگر وہاں رہے گا تو انشاء اللہ انسانیت آجائے گی۔ اس کے بغیر انسانیت نہیں آتی۔ دیکھئے انگریز اپنے بچوں کو کتنی تھوڑی عمر سے جدا کر دیتے ہیں۔ ایک بادشاہ کی حکایت لکھی ہے کہ اُس نے اپنے لڑکے کو کسی معلم کے سپرد کیا ایک روز دیکھا کہ معلم صاحب گھوڑے پر سوار ہیں اور شاہزادہ سائیس کے مثل پیچھے پیچھے چلا جا رہا ہے بادشاہ کو یہ دیکھ کر سخت ناگوار ہوا لیکن ضبط کر کے معلم سے یہ آہستگی دریافت کیا معلم نے کہا حضور چند روز میں یہ بادشاہ ہوگا مخلوق اس کی جلو میں ہوگی اگر اس وقت پیدل نہ دوڑے گا تو اُس وقت کیسے خبر ہوگی کہ پیدل دوڑنے والوں پر کیا گزر رہی ہے۔ اس لئے میں نے اس کو دوڑایا کہ یہ اپنی حالت یاد کر کے دوسروں پر رحم کرے تو یہ برتاؤ باپ نہیں کر سکتا اور اُستاذ کر سکتا ہے مگر ایسے اُستاذ نہیں جیسے آج کل کے اُستاذ ہیں ظالم اور قصائی جن میں شفقت نام کو نہیں۔ میں نے ایک بچے کو دیکھا کہ چار برس سے زیادہ اُس کی عمر نہ ہوگی اور لڑکے اُس کو ڈنڈا ڈولی کئے لا رہے ہیں۔ ع۔ پا بدستِ دگرے دست بدستِ دگرے۔ افسوس ہے کہ اکثر بچے ان ہی ذات الجبن کے قبضے میں آتے ہیں اور وہ تباہ و برباد ہوتے ہیں کہ اُن کے برتاؤ سے تو طبیعت کند ہو جاتی ہے یا پڑھنا چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ اور یہ پرانا مقولہ ہے کہ حافظ جی۔ ہڈی ہماری چمڑا تمہارا۔ صاحبو اُستاذ کے لئے ضروری ہے کہ وہ مربی ہو اور اگر ایسا نہ کر سکے تو وہ اُستاذ بننے کے قابل نہیں تو ایک طرف تربیت ہو ایک طرف تعلیم۔ پھر دیکھئے کہ یہ شخص کس شان کا نکلتا ہے۔ البتہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر لڑکوں کو علوم دینیہ پڑھایا جائے تو یہ لوگ کھائیں گے کہاں سے؟ تو اوّل تو امراء کو یہ سوال ہی نہ کرنا چاہئے اور غرباء کے لئے ساری قوم کو ادھر متوجہ ہو کر اس کے لئے سرمایہ جمع کرنا چاہئے کہ ان کی خدمت کریں۔ میں نے دیکھا ہے کہ اگر بچپن سے امارت میں گذرے تو ان کو روز اول ہی سے استغنار کی عادت ہو جائے بڑے ہو کر حرص وغیرہ نہیں ہوتی اور اگر اوّل ہی سوال اور ذلت کا خوگر ہو جیسا آج کل قوم کی بے توجہی سے ہو رہا ہے تو بڑے ہو کر وہی عادت رہے گی۔ پس آج کل جو اکثر طلبہ پر اعتراض کیا جاتا ہے یہ دافع میں اپنے اوپر الزام ہے۔ کیوں یہ نہیں کیا جاتا ہے کہ قوم طالب علموں کو اپنی اولاد کی طرح رکھے۔ مثلاً جس کے چار بچے ہیں وہ ایک طالب کو ملا کر پانچ سمجھے اور اُس طالب علم کی ہر طرح امداد کیا کرے۔ عالمگیر نے یہ کیا تھا تو ایک جماعت کی جماعت جو پریشانی میں مبتلا تھی کیسے آرام سے فارغ ہوئی اور انھوں نے کتنے بڑے بڑے کام کئے لیکن چونکہ عالمگیر رحمدلی کے ساتھ مدبر بھی تھے۔ ترکیب یہ کی تھی کہ طالب علموں کو جو پریشان دیکھا اور بیت المال کو بار سے

بچانا چاہا تو یہ صورت کی کہ ایک امیر دربار سے نماز کے فرائض پوچھے تو وہ بالکل کورے تھے۔ عالمگیر نے اُس اُس کو بہت ڈانٹا اور کہا کہ اتنے طالب علم شہر میں ہیں تم سے یہ نہیں ہو سکتا کہ اُن سے تھوڑی دیر مسائل سیکھ لیا کرو۔ پھر کیا تھا ہر شخص طالب علموں کا طالب ہو گیا اور سب طالب علم طعام و لباس و تنخواہ سے بے فکر ہو گئے۔ مگر یہ سب حکومت کی بدولت تھا کہ حکومت عجیب چیز ہے۔ مگر اب اتفاق باہمی بھی اُس سے زیادہ عجیب کام کر سکتا ہے۔ جب اس کی ضرورت ثابت ہو چکی ہے تو ضرور اس پر توجہ کرنی چاہئے۔ یہ تدبیر تو مولوی بنانے کی تھی۔ اب رہے وہ لوگ جو کہ مولوی نہ ہوں۔ اُن کے لئے ضروریات کی تعلیم ہونی چاہئے خواہ اردو میں ہو یا عربی میں مگر انگریزی کے قبل ہو کیونکہ پائدار اثر نقش اول کا ہوتا ہے۔ یہ مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ آنکھ کھولتے ہی انگریزی میں اُن کو لگا دیا جائے۔ تو اول تو قرآن شریف پڑھاؤ۔ اگر پورا نہ ہو تو دس سپارے [ع] ہی سہی اور اُس کے ساتھ ہی اُس کے روزانہ تلاوت کا بھی التزام رکھو اور اُس کے بعد کچھ رسالے مسائل دین کے اگرچہ اردو ہی میں ہوں اُن کو کسی عالم سے پڑھواؤ۔ اس کے بعد اگر ضرورت معاش مجبور کرے تو انگریزی بھی پڑھواؤ۔ لیکن اُس کے ساتھ ہی اگر دین کے خلاف اُس میں کوئی بات پیدا ہو تو فوراً اُس کو تنبیہ کرو، اور اگر باز نہ آئے تو انگریزی چھڑا دو۔ اب رہے وہ لوگ جو کہ بالکل ہی نہیں پڑھے اُن کے لئے یہ ترکیب ہے کہ ہر محلے کی مسجد میں ہر ہفتہ میں کم از کم ایک مرتبہ کسی سے مسائل اور اخلاق کی کتابیں پڑھوا کر اُن کو سنوا دیں۔ اور عورتوں کے لئے یہ کیا جائے کہ جو اُن میں سے پڑھ سکیں اُن کو اُن کے مرد دینی رسالے سنا دیا کریں اور جن کے مرد پڑھے نہ ہوں وہ خواندہ عورتوں سے سن لیا کریں اور ساتھ ہی جو مسائل پیش آئیں اُن کو مرد بلاواسطہ اور عورتیں بواسطہ مردوں کے علماء سے پوچھتی رہیں۔ یہ وہ ترکیب ہے کہ اگر اس پر کاربند ہو جائے تو چند روز میں ہی ساری جہالت کا خاتمہ ہو جائے گا اور تمام قوم میں دین پھیل جائے گا۔ یہ تو علم کے متعلق تھا۔ اب تیسری چیز کمی میں عمل ہے۔ اگر وہ نہ ہو تو علم کچھ بھی نہیں تو عمل کی تقسیم یہ ہے کہ ایک تو اعمال ظاہری ہیں اور ایک اعمال باطنی۔ اس وقت جو لوگ عمل کرتے بھی ہیں وہ صرف اعمال ظاہری پر متوجہ ہیں ورنہ باطن کی یہ حالت ہے کہ ؎

از بروں چوں گور کافر پر حلل — واندروں قہر خدائے عز و جل

از بروں طعنہ زنی بر بایزید — وز درونت ننگ میدارد یزید

کیا معنی کہ باطن اکثر لوگوں کا درست نہیں باطن کی درستی ایک تصحیح عقائد ہے۔ جس کو کم و بیش حاصل بھی

(حاشیہ: عوام کے دین حاصل کرنے کا طریقہ)

(حاشیہ: دین کا تیسرا جزو عمل اور اس کا بیان مفصل)

ع لوگوں کو اپنی حالت پر شرم کرنا چاہئے کہ حکیم امت مایوس ہو کر کس قدر تنزل کر کے رائے پیش کرتے ہیں۔ ۱۲ جامع۔

کیا جاتا ہے۔ دوسرے تہذیب اخلاق جس کو تصوف کہتے ہیں اور وہ بالکل متروک ہے جس کی دو وجہ ہیں ایک تو بے التفاتی اہل دنیا کی۔ دوسرے بے عنوانی منتسبین الی التصوف کی یعنی آج کل رسوم کا نام تصوف رکھ چھوڑا ہے۔ حقیقت تصوف کی ہے تعمیر الظاہر والباطن۔ ظاہر کا درست کرنا یہ ہے کہ اقوال وافعال سب شریعت کے موافق ہوں اور باطن کی درستی یہ ہے کہ قلب کی حالت درست ہو یعنی ایک تو اخلاق باطنی درست ہوں۔ توکل ہو شکر ہو۔ رذائل کو دور کیا ہو جیسے حب دنیا وغیرہ۔ یہ ہے تصوف۔ تو اس وقت لکھے پڑھے بھی صرف ظاہر کو لئے ہوئے اور جنھوں سنے باطن کو لیا۔ انھوں نے ظاہر کو چھوڑ دیا تو گویا تقسیم کر لیا ہے کہ جو ظاہر کو لیں وہ باطن کو چھوڑ دیں اور جو باطن کو لیں وہ ظاہر کو چھوڑ دیں اور بعض نے دونوں کو چھوڑ دیا وہ نہ نماز روزہ کریں نہ تصفیہ باطن۔ بلکہ حب دنیا میں حب جاہ میں غرق ہیں اور یہ تینوں قسم کے لوگ تصوف سے بمراحل دور ہیں۔ غرض تصوف اصلاح ظاہر و باطن کا نام ہے نہ کہ رسوم کا بلکہ احوال متعارفہ کا بھی نام نہیں۔ یہ احوال اگر نہ بھی ہوں تو نسبت مع اللہ پیدا ہو سکتی ہے جس کا اثر یہ ہے کہ طاعت میں سہولت ہو اور دوام ذکر پر توفیق ہو نہ ہی رسوم کہ قبر پر کپڑے چڑھانا عرس کرنا کپڑے رنگین پہننا۔ سمع سننا۔ سو اس کو کوئی تعلق تصوف سے نہیں ہے اور احوال اگرچہ کبھی مقامات پر مترتب ہو جاتے ہیں لیکن وہ تصوف کے اجزاء یا اُس کے لوازم نہیں۔ اب لوگوں کی یہ حالت ہے کہ اگر ذکر میں کبھی اُن کو وجد وغیرہ ہونے لگے تو سمجھتے ہیں کہ اصل مقصود حاصل ہو گیا اور اگر نہ ہو تو سمجھتے ہیں کہ فائدہ ہی نہیں ہوا حالانکہ ذکر سے مقصود یہ نہیں بلکہ حقیقی مقصود یہ ہے کہ حکم ہے فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ جس کا ظہور آخرت میں ہوگا اور عاجل مقصود یہ ہے کہ کثرت ذکر سے نسبت مع اللہ ہو جائے اور اُس سے سہولت فی الطاعۃ ہو تو یہ ایک غلطی تو متصوفین کو ہوئی دوسری غلطی منکرین کو ہوئی کہ انھوں نے صوفیہ کو خشک دماغ بتلایا حالاں کہ وجد وغیرہ کا سبب یہ نہیں اگرچہ اس میں بھی شک نہیں کہ کبھی اس میں تھوڑا دخل احوال طبیعہ کو بھی ہوتا ہے۔ غرض ان کو عین تصوف سمجھنا بھی غلطی ہے اور بالکل مباین خارج سمجھنا بھی غلطی ہے۔ فیصلہ یہ ہے کہ داخل تو نہیں مگر متعلق ہے۔ اور ایک درستی قلب کی یہ ہے کہ عقائد درست ہوں۔ اُس کو مفصل بیان کر چکا ہوں۔ جس کے اعادے کی ضرورت نہیں۔ ہاں رہا عمل ظاہر تو وہ ظاہر ہی ہے۔ پس یہ آیت علم و عمل کی تمام شاخوں کو جامع ہے کہ ہمارے نبی آئیں گے اور وہ یہ اہتمام کریں گے۔ اب آپ کو اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ یہ تینوں چیزیں کیسی ضروری ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیسے شفیق تھے کہ ایسی باتیں بتلائیں کہ اگر ان کو چھوڑ دیا جائے تو دین اور دنیا سب بگڑ جائے۔ دین کا بگڑنا تو ظاہر ہے اور دنیا اس لئے کہ مسلمانوں کے ساتھ خدا کا یہ معاملہ ہے کہ جب یہ دین چھوڑتے ہیں تو دنیا بھی اُن سے رخصت ہو جاتی ہے۔ دوسرے دنیا نام ہے راحت کا اور

دین کو چھوڑ کر راحت نصیب نہیں ہوتی ۔ تو جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اتنی بڑی رحمت ہیں تو اب یہ دیکھیے کہ آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حق کیا ادا کیا ۔ دیکھو! حضور کے تین حق ہیں ۔ ایک یہ کہ آپ کے ساتھ محبت ہو ۔ دوسرے یہ کہ آپ کی عظمت قلب میں ہو ۔ تیسرے یہ کہ آپ کی متابعت کی جائے۔ اس وقت بعض نے تو عظمت کو تو لیا مگر محبت اور متابعت دونوں کو چھوڑ دیا تو بعض نے متابعت تو کی مگر محبت اور عظمت کو چھوڑ دیا اور بعض نے محبت وعظمت دونوں کو لیا مگر متابعت چھوڑ دی ۔ میں نے اس مضمون کو القاسم میں لکھ دیا ہے ۔ یہ ایک ماہوار رسالہ ہے جو کہ بہت ہی مفید ہے ۔ میں یہ بھی رائے دیتا ہوں کہ لوگ اس کو خریدیں ۔ اس میں اختلافی مسائل نہیں ہیں بلکہ محض متفق علیہ اصلاح ہے بہرحال یہ حقوق ہیں آپ کے ۔ اور آپ اللہ کی بڑی نعمت ہیں اور نعمت کی قدر یہ ہے کہ اس کے حقوق ادا کریں اور وہ ابھی مذکور ہوئے ہیں ۔ اب میں ختم کرتا ہوں اور خدا تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ ہم سب کو توفیق نیک عطا فرمائیں ۔ آمین ۔ تمت ۔

ہماری مطبوعات

الحمد للہ علی احسانہ کہ مکتبہ جامی واخوانہ کے زیر انتظام مندرجہ ذیل کتابیں شایع ہو چکی ہیں جو کتابیں ہمارے یہاں کی مطبوعہ نہیں ہیں فی الحال انکی فراہمی کا کوئی خاص انتظام نہیں ہے اس لئے ہماری مطبوعات کے علاوہ دوسری کتابوں کی فرمائش اس وقت تک بے سود ہے جب تک کہ ہم لوگ دوسری مطبوعات کی تجارت کا باقاعدہ انتظام نہ کرلیں۔

(کتب مطبوعہ) **مناجات مقبول کبریٰ** (۲۵۲ صفحات سابق نسخوں پر گیارہ اضافات کے ساتھ) قیمت ۱۲؍ **وصیۃ الاحسان** تعلیمات حضرت مولانا شاہ محمد وصی اللہ صاحب دامت برکاتہم جسمیں زمانہ حال کے سکہ رائج الوقت یعنی نفاق علمی واعتقادی پر مبسوط و پر اثر کلام فرمایا گیا ہے۔ قیمت گیارہ آنہ۔ **فوائد الصحبۃ** صحبت کی اہمیت اور اس کی تاثیر پر عمدہ رسالہ (مولفہ حضرت مرشدی مولانا شاہ محمد وصی اللہ صاحب دامت برکاتہم) قیمت ۱۲؍ **تحفۃ السالکین** (حضرت قاضی صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کے رسالہ مشہورہ ارشاد الطالبین کے ترجمہ قدیم کا جدید اڈیشن) قیمت ۱۰؍ **معمولات نبوی کامل ۵ حصے** (مسلمان کیلئے مختصر مگر ضروری نظام حیات اور اسوۂ زندگی بتانے والی ایک عام پسند کتاب مکتبہ جامی واخوانہ) قیمت صرف ۱۲؍ **تعلیم القرآن** (اگر کسی ماہر اہل علم سے اسکو پڑھا جائے تو صرف ترجمہ قرآن شریف بہت ہی قلیل مدت میں آجائے گا البتہ قرآن فہمی کیلئے کسی مرد کامل کی صحبت کیمیا صفت کی ضرورت باقی رہے گی اس سے بے نیازی کسی طرح نہیں ہو سکتی) قیمت ۷؍ **سنسار گرو** (بعض احوال رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم بزبان ہندی سہل) قیمت ۸؍ **آئینہ سیرت** (نقشہ کی صورت میں ترتیب وار ہر سال کے مشہور خاص واقعات نبوی کو نمایاں کیا گیا ہے جس کو آپ آئینہ کی طرح اگر فریم میں لگوا کر مکان میں آویزاں کریں تو آپ کو اپنی صورت کی بجائے سیرت آں سرور صلی اللہ علیہ وسلم نظر آئیگی) قیمت ۴؍

مواعظ اشرفیہ مطبوعہ ان کتابوں کے علاوہ حضرت حکیم الامۃ علیہ الرحمہ کے ان مواعظ سے جو دین پیدا کرنے میں بے نظیر ہیں حسب ذیل مواعظ شایع ہو چکے ہیں ان میں سے کچھ تو متفرق و منتشر طور پر ہیں اور بقیہ مواعظ دعوات عبدیت کے سلسلے کے ہیں جنکی طباعت بحمدہ تعالیٰ رسالہ الاحسان کے ذریعہ برابر جاری ہے چنانچہ دعوات عبدیت کی حصہ اول کے جملہ مواعظ (جن کی تعداد دس ہے) شایع ہو چکے ہیں امسال محرم ۱۳۷۵ھ سے دوسری جلد کی اشاعت شروع ہوئی ہے یہ رسالہ الاحسان کے علاوہ علیحدہ سے بھی دستیاب ہو سکتے ہیں۔ متفرق مواعظ شرف المکالمہ، الرحمہ علی الامۃ، شفاء العی، شرط الایمان، غوائل غضب، الحج المبرور۔ دعوات عبدیت حصہ اول۔ آداب المساجد، مہمات الدعا اول و دوم، سیرۃ الصوفی استخفاف المعاصی، حقوق المعاشرہ، الاخلاص اول و دوم، اصلاح النساء، ذم الہوی (دعوات عبدیت حصہ اول یکجا غیر مجلد)

نوٹ:۔ مواعظ میں چونکہ ابتداءً اصل قیمت کی تجویز میں کافی رعایت مدنظر رکھی گئی ہے کہ نفع عام ہو سکے اس لئے تاجر صاحبان کیلئے ۲۰ فیصدی سے زائد کمیشن کی گنجائش نہیں ہے۔

چند نادر و نایاب اسلامی کتب

۱۔ تفسیر بیان القرآن ۔ کامل ۱۲ جلدوں میں مجلد ۔ حکیم الامۃ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی علیہ الرحمۃ		۶۰/-
۲۔ اسلام اور عقلیات کامل ۲ حصص	〃 〃 〃 〃	۱۰/-
۳۔ مسئلہ تقدیر	〃 〃 〃 〃	۴/-
۴۔ حکایات اولیاء	〃 〃 〃 〃	۷/-
۵۔ اسلام کا نظام صلوٰۃ	مولانا محمد علی صدیقی	۱/۸
۶۔ کتاب التوحید معہ عربی ترجمہ اُردو	امام محمد بن عبدالوہاب	۴/-
۷۔ اسلامی دستور حیات	مولانا عبدالقیوم ندوی	۲/-
۸۔ تعارف القرآن	ڈاکٹر محمد احمد صدیقی	۱/۸
۹۔ فقہ اکبر ترجمہ اردو	امام ابوحنیفہ	۴/۸
۱۰۔ فضائل صدقات کامل ۲ جلدوں میں	مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث مظاہر علوم	۷/۶
۱۱۔ اشاعت اسلام	مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی سابق مہتم دارالعلوم	۶/-
۱۲۔ خیر المؤانس ترجمہ اردو نزہۃ المجالس		۳۰/-
۱۳۔ تذکرۃ الواعظین	مولوی محمد جعفر صاحب حنفی	۶/-
۱۴۔ تجدید تصوف وسلوک	مولانا عبدالباری ندوی	۵/-
۱۵۔ حکیم الامت	مولانا عبدالماجد دریا آبادی	۸/۸
۱۶۔ حیوانات قرآنی	〃 〃 〃	۲/-
۱۷۔ حجۃ اللہ البالغہ ۔ ترجمہ اُردو	حضرت شاہ ولی اللہ صاحب علیہ الرحمۃ	۲۰/-
۱۸۔ حصن حصین عربی معہ ترجمہ اردو		۸/-
۱۹۔ مشکوٰۃ شریف ترجمہ اردو ، کامل ۲ جلدوں میں		۱۶/-
۲۰۔ بخاری شریف	〃 ۳ 〃 〃	۲۴/-
۲۱۔ قادیانی مذہب کا علمی محاسبہ	سید الیاس برنی	۸/-

نوٹ : مندرجہ بالا کتب کے نسخے بہت تھوڑی ہی تعداد میں رہ گئے ہیں۔ اس لئے آپ اپنی منتخب شدہ کتابوں کی فرمائش جلد ہی ارسال کریں۔

کتابوں کے منگوانے کا پتہ ۔ کتب خانہ اسلامیہ الہ آباد ۳